www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2025

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

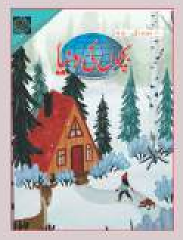

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

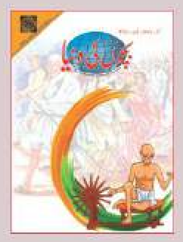

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:15 روپے   سالانہ:145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

مشعل	مدیر	4

شخصیات

ہیلن کیلر: ایک محرک اور امید افزا شخصیت	ظفر الاسلام	5
نشاط النساء بیگم: تحریک آزادی کی علمبردار	رضیہ سلطانہ	9
ابن کنول کے افسانوں میں داستانوی اثرات	محسنہ نگار	14
لطف الرحمٰن کا رنگِ تغزل 'بوسۂ نم' کے حوالے سے	صبیحہ شمیم	17
قاسم خورشید: قلم و ادب کے خورشید تاباں	شبانہ عشرت	22

جہان نسواں

تانیثیت کا ایک پہلو: عالمی یوم خواتین	رابعہ ناز	26
کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور خواتین	عادل حسین بٹ	31
اردو ادب اور جموں و کشمیر کی خواتین	روحی جان	36
اردو ادب میں خودنوشت	فرحین خانم	40

حسن سخن

قدسیہ انجم علیگ، نورینہ پروین، سعیدہ شکیل، شمشاد بیگم سنبل	44

افسانے

سرخ گلاب	نسترن احسن فتیحی	46
داغ دل ہم کو یاد آنے لگے ہیں...	رینو بہل	51

صحت

حفظان صحت: خواتین کے تناظر میں	مہر فاطمہ حسین	56

ارتباط

مباحثہ/ قارئین کے خطوط	61

اردھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 9 شمارہ: 3 مارچ 2025

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا- 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000

شعبۂ ادارت: 011-49539009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد- 500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

8 مارچ عالمی یوم خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔اس کی شروعات امریکہ سے ہوتی ہے جب خواتین نے تنخواہ کے مسئلے پر مظاہرہ کیا۔اس احتجاج کو بغاوت میں شمار کیا گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ اسے پیروں تلے کچل دیا گیا۔ 1908 میں پھر امریکہ میں ہی سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی ۔اس کا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ خواتین کو تحفظ دیا جائے۔اس کے بعد پارٹی نے خواتین کے مسائل اور اس کے حل کے لیے وومین نیشنل کمیشن تشکیل دیا۔اس سلسلے میں بڑی محنت ومشقت سے کام لیا گیا اور پھر پہلی مرتبہ 28 فروری کے آخر میں عالمی یوم خواتین منایا گیا۔اس کے بعد پہلی عالمی خواتین کانفرنس کے حوالے سے کوپن ہیگن کا نام تاریخ میں درج ہوا۔یہ کانفرنس 1910 میں منعقد ہوئی۔خواتین بیداری کے سلسلے میں ایک تاریخی کام یہ ہوا کہ خواتین نے تمام یوروپ میں 8 مارچ 1913 کو زبردست ریلیاں نکالیں اور اس مشن کو پورا کرنے کے لیے مختلف پروگرام بھی منعقد کیے۔اس وقت سے آج تک یہ دن عالمی یوم خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔دنیا کے کئی ممالک اس دن خواتین خدمت گزاروں کے لیے تعطیل کا اہتمام کرتے ہیں۔اس حوالے سے چین، نیپال اور روس جیسے ممالک کے نام لیے جاسکتے ہیں۔بعض ممالک جہاں باضابطہ چھٹی کا اہتمام نہیں وہاں بھی خواتین کے لیے بہت سے پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔

زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین کی حیثیت گھنے درخت کی جڑوں کی طرح ہے۔ان کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔زندگی کے تمام رشتے ان کے وجود سے تشکیل پاتے ہیں۔اردو ادب میں بھی وجودِ زن نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔اردو کے شعری اور نثری سرمائے میں بیشتر رنگ خواتین کے نظر آتے ہیں۔ولی سے لے کر میر، سودا، قائم، غالب، مومن، ذوق، انشا، مصحفی، آتش، ناسخ تک کی شاعری میں وجودِ زن کے مختلف رنگ نظر آئے۔ولی کے یہاں ایک الگ عورت نظر آئی تو میر کی شاعری میں عورت ایک علاحدہ رنگ کی حامل تھی۔غالب نے اپنی شاعری میں جس نوع کی خاتون پیش کی اس کا رشتہ خود ان کے مزاج اور طبیعت سے بہت گہرا ہے۔بعد کے شاعروں کے یہاں بھی علاحدہ علاحدہ عورت نظر آئی۔خواتین کے لب ورخسار ہی نہیں ان کے جذبہ واحساس، ادراک وخیال اور نگاہ ورفتار کی بھی امیجری ہوئی۔حسرت موہانی تک آتے آتے اردو شاعری کی عورت بہت تبدیل ہوگئی اور اس کی جیسی تصویر نظر آئی اس میں عورت خیال وتصور کے بالمقابل حقیقی نئے اور مہذب معاشرے کی پروردہ محسوس کی گئی۔نئی شعری روایت میں عورت کے حقوق اور تحفظ کے مسائل کو نہایت ادب واحترام کے ساتھ پیش کیا گیا۔ان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل کو شعوری طور پر بروئے کار لایا گیا۔وجودِ زن کے سیاق میں زندگی کی جس قدر متنوع تعبیر کی گئی، زندگی کے دوسرے مظاہر کی اتنی تصویر نظر نہیں آئی۔ہر زمانے میں خواتین کے جذبہ واحساس کی ایک نئی تصویر پیش کی گئی۔یہ بھی ہوا کہ ہر زمانے میں اظہار کی سطح پر بھی تبدیلی دیکھی گئی۔اگر اردو شاعری سے وجودِ زن کے رنگوں کو محو کر دیا جائے یا ان کے رنگوں کو دھندلا دیا جائے تو دوسرے موضوعات ومضامین کے رنگ بھی اپنی دھنک کھو بیٹھیں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں شامل تمام رنگوں کو علاحدہ علاحدہ طور پر دیکھنا محال نہیں تو مشکل امر ضرور ہے۔ان تمام رنگوں میں ایک گہرا انسلاک ہے۔

آپ کا

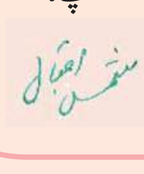

ظفر الاسلام

ہیلن کیلر

ایک محرک اور امید افزا شخصیت

دنیا میں جسمانی طور پر معذور افراد کو ہمیشہ سے ایک چیلنج کے طور پر دیکھا جاتا ہے لیکن کچھ معذور شخصیات نے اپنی محنت، صلاحیت اور بلند حوصلہ کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ معذوری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہرگز نہیں ہے۔ وہ لوگ جو جسمانی طور پر معذور تھے انھوں نے اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کیا اور یہ ثابت کیا کہ انسان کی اصل طاقت اس کا عزم اور ارادہ ہے۔ تھامس ایڈیسن سماعت سے محروم تھے لیکن انھوں نے کئی چیزیں ایجاد کیں جن میں بلب ناقابل فراموش ہے۔ مشہور سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ کی زندگی کا بیش تر حصہ وہیل چیئر پر بسر ہوا مگر انھوں نے بلیک ہولز اور دوسرے قدرتی مظاہر پر کافی اہم کام کیا۔ نیل ارنسٹ ایک حادثے میں اپنی ٹانگ گنوا بیٹھے تھے اس کے باوجود انھوں نے پیرا اولمپک کھیل میں حصہ لیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ لوئی بریل بصارت سے محروم تھے لیکن انھوں نے نابینا افراد کے لیے بریل رسم الخط ایجاد کیا۔ اس فہرست میں ایک اہم نام ہیلن کیلر کا بھی ہے۔ وہ ایک ایسی خاتون تھیں جنھوں نے بینائی، سماعت اور گویائی سے محروم ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کی، کئی کتابیں لکھیں اور زندگی بھر سماجی خدمات انجام دیتی رہیں۔ بیشک ان کی زندگی معذوروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔

ہیلن کیلر 27 جون 1880 میں امریکا کے ایک قصبہ شمالی الاباما ٹیکومبیا میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام آرتھر ایچ کیلر تھا جو دفاعی فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ پیدائش کے وقت ہیلن عام بچوں کی طرح صحت مند اور تندرست تھیں۔ ان کے فیملی ڈاکٹر کے مطابق 1882 میں انھیں دماغی بخار ہوا لیکن حتمی طور پر آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انھیں کون سی بیماری ہوئی تھی۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ان کو Meningitis ہوا تھا۔ بخار اترنے کے بعد ان کے والدین کو یہ احساس ہوا کہ ہیلن نہ اب سن سکتی ہے، نہ ہی دیکھ سکتی ہے اور جلد ہی وہ بولنا بھی بھول گئیں۔ اس طرح محض انیس ماہ کی عمر میں وہ قوت گویائی، بینائی اور سماعت جیسی نعمتوں سے محروم ہوگئیں۔ اب وہ ایک ایسے جسم میں محبوس ہوگئیں تھیں جہاں یا تو اندھیرا تھا یا خاموشی۔ ہیلن کے والدین کے لیے یقیناً یہ ایک بہت ہی بڑا سانحہ تھا مگر انھوں نے اس حقیقت کو جلد ہی قبول کرلیا۔ ان کی والدہ ہمہ وقت یہی جاننے کی کوشش میں لگی رہتیں کہ ہیلن کی زندگی کو کس طرح کامیاب بنایا جائے۔ اتفاقاً انھوں نے 'چارلس ڈکنز' کا ایک سفرنامہ پڑھا جس میں بصارت اور سماعت سے محروم ایک بچی 'لارا' کی کہانی بیان کی گئی تھی، کہ اس نے ان محرومیوں کے باوجود کس طرح تعلیم

حاصل کی۔فوراً ہی انھوں نے ہیلن اور ان کے والد کو بالٹیمور، میری لینڈ روانہ کیا جہاں ڈاکٹر جولیان نے ان کا معائنہ کیا اور انھیں ڈاکٹر الیگزینڈر گراہم بیل کے پاس بھیجا۔وہیں پر ان کی ملاقات ان کی ٹیچر این سلیوان سے ہوئی جنھوں نے ہیلن کو تاریکی سے نکالا اور دنیا کو تعجب میں ڈال دیا۔ہیلن کی زندگی میں یہ حیرت انگیز تبدیلی این سلیوان کی ان تھک جدوجہد اور کوشش کی وجہ سے آئی۔کسی وجہ سے این سلیوان کی بینائی جاتے جاتے بچی تھی۔لہٰذا قدرت کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے انھوں نے سماعت اور بصارت سے محروم ہیلن کی خدمت کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ان کے اخلاص اور صبر وتحمل نے معصوم ہیلن کو زندگی کی روشنی اور کامیابی عطا کی۔ہیلن اور این سلیوان میں بے انتہا محبت تھی اور وہ اس وقت ختم ہوئی جب 1936 میں این سلیوان اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

ہیلن کیلر اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

''میری زندگی میں میری یاد کے مطابق سب سے اہم دن وہ دن ہے جب میری استانی این سلیوان میرے پاس آئیں۔اس دن نے جن دو زندگیوں کو آپس میں ملا دیا ان کے غیر معمولی تضاد پر غور کر کے مجھے حیرت ہوتی ہے۔وہ مارچ 1887 کا تیسرا دن تھا یعنی میرے سات برس کی عمر کو پہنچنے سے تین مہینے پہلے۔''

(ہیلن کیلر، ص29)

ہیلن کی زندگی میں تبدیلی لانا آسان نہیں تھا کیوں کہ بیرونی دنیا سے اثر قبول کرنے والی ان کی تمام قوتیں مثلاً گویائی، بینائی اور سماعت معدوم تھیں، جس کی وجہ سے ان کی فطرت میں ایک عجیب سی وحشت پیدا ہوگئی تھی۔این سلیوان ان کی تربیت میں مصروف رہتی تھیں لیکن بعض دفعہ وہ ان کی بے جا ضد اور وحشیانہ ہٹوں سے مایوس بھی ہو جاتی تھیں۔ جب ہیلن سات برس کی تھیں تو ان کے سامنے جو چیزیں آتیں وہ انھیں توڑ ڈالتیں۔سلیوان کو ان کی تربیت میں بڑی جاں فشانی کرنی پڑی، آخر کار ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ہیلن نے سب سے پہلے جو الفاظ سیکھے وہ 'گڑیا' اور 'کیک' تھے۔امریکی طریقے کے مطابق الفاظ کی شکلیں ان کی ہتھیلی پر بنائی جاتی تھیں، رفتہ رفتہ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ دنیا میں ہر چیز کا ایک نام ہے۔شروع میں سلیوان کو یہ سمجھانے اور بتانے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔لیکن ایک مرتبہ ابتدا ہو جانے کے بعد ہیلن نے حیرت انگیز طور پر ترقی شروع کر دی۔کیوں کہ ان کی فہم و فراست عام لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔این سلیوان نے ہیلن کو بڑی محنت سے پڑھایا۔وہ ہیلن کا ایک ہاتھ پانی میں ڈالتیں اور اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اسے ریت پر پانی لکھنا سکھاتیں۔بے شک یہ ایک مشکل کام تھا مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور مسلسل محنت کرتی رہیں۔آٹھ برس کی عمر میں ہیلن کو معذور بچوں کے اسکول میں داخل کرایا گیا۔اس اسکول میں ہیلن کی استانیوں نے ان پر خوب محنت کی، وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں پر رکھتیں اور پھر آہستہ آہستہ اسے کوئی لفظ بولنا سکھایا جاتا۔ہیلن نے اس سے ملتی جلتی کئی مشقیں بھی کیں۔

دس برس کی عمر میں ہیلن نے پھر سے بولنا شروع کر دیا اور علم نباتات، علم حیوانات، جغرافیہ اور ریاضی وغیرہ مضامین کا مطالعہ شروع کر دیا۔اس وقت تک انھیں بریل پر بھی مہارت حاصل ہوگئی تھی اور انھوں نے ٹائپ رائٹر کا استعمال کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔جب وہ بریل میں ٹائپ کی ہوئی کتابیں پڑھنے لگیں تو ان کے ذہن میں نئی دنیا کی دل فریبیاں جلوہ گر ہوئیں اور بہت جلد ان کے اندر سے تنہائی اور بے حسی کا احساس ختم ہو گیا۔سولہ برس کی عمر میں انھیں اتنا بولنا آ گیا تھا کہ وہ اسکول اور پھر کالج میں داخلہ لے سکیں۔تعلیم کے دوران، ان کی استاد این سلیوان ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں اور یونیورسٹی میں بھی وہ تعلیم میں ان کی مدد کرتی رہیں۔دوسرے طالب علموں کی طرح چوں کہ ہیلن پروفیسروں کے لکچر سن نہیں سکتی تھیں لہٰذا سلیوان ان کی ہتھیلی پر لکچروں کو انگلی سے لکھتی تھیں اور وہ تمام مضامین کو یاد کر لیا کرتی تھیں۔ جس وقت وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں بی۔اے کے امتحان میں شریک ہوئیں تو انھوں نے سوالوں کے جوابات اس قدر کمال کے ساتھ ٹائپ کیے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے عجائب خانہ میں آج بھی محفوظ ہیں۔1904 میں ہیلن نے ریڈ کلف کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد بھی ان کے سیکھنے کا عمل مسلسل جاری رہا، انھوں نے دنیا کی مختلف زبانیں سیکھیں اور ان میں مہارت حاصل کی۔

گریجویشن کرنے کے ساتھ ہی وہ معذور افراد کو جینے کا حوصلہ دینے لگیں اور ان کی ہر طرح سے مدد کرنے لگی تھیں۔ وہ مختلف ممالک اور اداروں میں لکچر دینے جاتیں اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے معذور افراد کو زندگی گزارنے کا ہنر سکھاتی تھیں۔ انھوں نے بینائی، سماعت اور گویائی سے محروم لوگوں کے حقوق کے لیے مختلف کام کیے اور ان سے متعلق غلط تصوّرات کو دور کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔

گریجویشن کرنے کے ساتھ ہی وہ معذور افراد کو جینے کا حوصلہ دینے لگیں اور ان کی ہر طرح سے مدد کرنے لگی تھیں۔ وہ مختلف ممالک اور اداروں میں لکچر دینے جاتیں اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے معذور افراد کو زندگی گزارنے کا ہنر سکھاتی تھیں۔ انھوں نے بینائی، سماعت اور گویائی سے محروم لوگوں کے حقوق کے لیے مختلف کام کیے اور ان سے متعلق غلط تصوّرات کو دور کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتی تھیں کہ اگر معذوروں کو موقع دیا جائے تو وہ بھی عام لوگوں کی طرح بھرپور اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہیلن کیلر نے اپنی تمام تر زندگی دنیا بھر کے بصارت اور بینائی سے محروم افراد کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ امریکا میں نابینا افراد کے لیے قائم کردہ تنظیم کے پلیٹ فارم سے جڑنے کے بعد انھوں نے دنیا کے انتالیس ممالک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ نابینا بچوں کی تربیت کے لیے لکچر دیے۔ انھوں نے نابینا افراد کے لیے ایک ادارہ بھی قائم کیا اور اس کے لیے لاکھوں روپیے جمع کیے۔ یہاں تک کہ وہ امریکا میں معذوری کو شکست دینے والی عورت کے طور پر پہچانی جانے لگیں۔ ہیلن صبح سے شام تک اپنے کاموں میں مصروف رہتیں، اس کے باوجود وہ ان خطوط کا جواب ضرور دیتیں جو دنیا کے مختلف گوشوں سے ان کے پاس تشکر و اعتراف کے طور پر آتے تھے۔

ہیلن کے لیے لہریں حقیقی گفتگو کے مترادف تھیں۔ وہ بات کرنے والے کے نتھنوں، ہونٹوں اور گلے پر انگلیاں رکھ کر اس کی باتیں، خیالات اور جذبات سمجھ لیتی تھیں۔ ان کی قوت لامسہ اس قدر تیز تھی کہ وہ محض لوگوں کے ہاتھوں کو چھو کر ان کے احساسات اور کیریکٹر معلوم کر لیتی تھیں۔ ہیلن زندگی کی تفریحات سے خوب بہرہ اندوز ہوتی تھیں۔ نابینا ہونے کے باوجود وہ کشتی چلا لیتی تھیں اور تیراکی کر لیتی تھیں۔ انھیں گھڑسواری کرنا اور ہوائی پرواز کرنا بھی خوب پسند تھا۔ پولی تھامسن کے ساتھ وہ اکثر سنیما اور تھیٹر جاتی تھیں اور اپنی حس کے ذریعے اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ ہیلن بارچہ پر ہاتھ رکھ کر موسیقی سے اسی طرح لطف اندوز ہوتی تھیں جس طرح کوئی ماہر فن موسیقار اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ انھیں جانوروں سے بھی محبت تھی اور ان کے مکان پر ہر قسم کے پالتو آبی اور بری جانور موجود رہتے تھے۔ اکثر وہ اپنے باغیچے میں ٹہلتے ہوئے خود کلامی کیا کرتی تھیں۔ این سلیوان کی مدد سے وہ اشاروں کی زبان سمجھتی تھیں لیکن انھیں سمتوں کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ''مجھے اندھے ہونے کا اتنا دکھ نہیں ہے جتنا اس بات کا ہے کہ میں سن نہیں سکتی۔ تاریکی کی دنیا میں یہ بہرہ پن ایک دیوار کی طرح حائل ہے۔ میں جس چیز کے لیے سب سے زیادہ ترستی ہوں وہ انسانی آواز اور لب ولہجہ ہے۔'' ہیلن کیلر 1955 میں پولی تھامسن کے ہمراہ ہندوستان آئیں، اس دوران انھوں نے اٹھارہ کانفرنسوں میں شرکت کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ربندر ناتھ ٹیگور سے ان کی ملاقات ہوئی۔

ہیلن کیلر تمام عمر نابینا رہیں لیکن انھوں نے بریل مشینی تکنیک کی مدد سے بہت ساری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ان کا دل نہایت صاف، ان کے خیالات بے حد پاکیزہ اور ان کا عزم بہت ہی پختہ تھا۔ وہ خود کہتی تھیں کہ ''میرے پاس کوئی لمحہ فرصت کا نہیں ہے اور میرے اندر ایک ضمیر ہے جو مسلسل مشاہدہ کرتا ہے، آزماتا ہے اور نظریات قائم کرتا ہے۔ میں کھڑکی سے باہر نہیں دیکھ سکتی ہوں، نہ چہرہ دیکھ سکتی ہوں اور نہ آواز اور لب ولہجہ معلوم کر سکتی ہوں۔ لیکن اس کے

باوجود میں تجربات کی ایک گراں قدر دولت کی مالک ہوں۔ ہر ایک کے ہاتھوں کی حرکت، پاؤں کی آہٹ خوشی اور غمی میرے دل پر گہرے نقوش قائم کرتی ہے اور میں اس سے اثر پزیر ہوتی ہوں۔'' ہیلن ان تمام احساسات سے محروم تھیں جو انسانی زندگی کو دلکش اور حسین بناتی ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس گہری سچائی کا پتا لگایا کہ ہم اپنی تمام صلاحیتوں کو کھو بیٹھے ہیں۔ کسی نے جب ہیلن سے محبت کی حقیقت کو دریافت کیا تو انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ محبت وہ مقدس اور عالم گیر جذبہ ہے جو دنیا کا ہر شخص دوسرے شخص کے لیے اپنے اندر پاتا ہے۔

''ہیلن کیلر نے چودہ کتابیں تصنیف کیں جن میں 'دی اسٹوری آف مائی لائف'، 'لائٹ ان مائی ڈارکنیس'، 'دی ورلڈ آئی لو ان'، 'دی ٹچ آف میجک'، 'مائی ریلیجن' وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی دوست پولی تھامسن کی مدد سے 'ہیلن کیلرز جرنل' شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تقریباً 475 مضامین بھی لکھے۔ ہیلن کیلر کو ان کی خدمات کے لیے متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں اعلیٰ ترین شہری اعزاز 'پریزیڈنیشنل میڈل فار فریڈم' ہے۔ انھیں ہارورڈ یونیورسٹی، برلن یونیورسٹی اور دھلی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ ان کو ایک ماہر تعلیم کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انھوں نے 'امریکن فاؤنڈیشن فار دی بلائنڈ' کی بنیاد ڈالی۔''

ہیلن کیلر نے چودہ کتابیں تصنیف کیں جن میں 'دی اسٹوری آف مائی لائف'، 'لائٹ ان مائی ڈارکنیس'، 'دی ورلڈ آئی لوان'، 'دی ٹچ آف میجک'، 'مائی ریلیجن' وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی دوست پولی تھامسن کی مدد سے 'ہیلن کیلرز جرنل' شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تقریباً 475 مضامین بھی لکھے۔ ہیلن کیلر کو ان کی خدمات کے لیے متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں اعلیٰ ترین شہری اعزاز 'پریزیڈینشل میڈل فار فریڈم' ہے۔ انھیں ہارورڈ یونیورسٹی، برلن یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ ان کو ایک ماہر تعلیم کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انھوں نے 'امریکن فاؤنڈیشن فار دی بلائنڈ' کی بنیاد ڈالی۔

ہیلن نے اپنی زندگی پر ایک فلم بھی بنائی، جو پولی تھامسن کی مدد سے تیار ہوئی۔ وہ فلم کی تیاری کے وقت ڈائرکٹر کی ہدایات کو ہیلن کے پاؤں پر انگلیوں کے اشارات سے سمجھاتی تھیں۔ دنیا کی دوسری خواتین کی طرح ہیلن بھی امریکہ کے مشہور ایکٹر چارلی چیپلن سے مل کر ان کی شاندار شخصیت اور دلکشی سے بہت خوش ہوئیں۔ کاروسو سے بھی ان کے دوستانہ تعلق تھے، اس کے متعلق وہ کہا کرتی تھیں کہ جس وقت اس کے لبوں پر میری انگلیاں پہنچیں اس کی سنہری اور دلکش آواز میرے ہاتھوں میں سما جاتیں۔ بالی ووڈ کی مشہور فلم 'بلیک' ہیلن کیلر ہی کی زندگی پر مبنی ہے، جس میں رانی مکھرجی نے ہیلن اور امیتابھ بچن نے مس سلیوان کا کردار ادا کیا ہے۔ فلم کے ہدایت کار سنجے لیلا بھنسالی نے خلاصہ کیا تھا کہ وہ ہیلن کیلر کی زندگی سے کافی متاثر ہیں۔

ہیلن کیلر نے بصارت اور سماعت سے محرومی کے باوجود ایک بھرپور زندگی گزاری اور دنیا کے لیے یہ مثال قائم کی کہ انسان اپنی محنت اور مضبوط ارادوں سے ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ آج بھی انھیں عزم و ہمّت اور حوصلے کی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ 87 برس کی عمر میں یکم جون 1968 کو ہیلن کیلر نے اس دنیا کو الوداع کہا۔ آج دنیا کی بڑی بڑی تعلیمی درس گاہوں میں ان پر تحقیقی کام کیے جا رہے ہیں۔

Dr. Zafrul Islam

F-245 Ground Floor, Shaheen Bagh

Abul Fazal Enclave part II

Jamia Nagar Okhla, New Delhi, 110025

Mob- 9336239933

email-zafar.ghosi@gmail.com

رضیہ سلطانہ

نشاط النساء بیگم

تحریکِ آزادی کی علمبردار

نشاط النساء بیگم ایک اہم تاریخی شخصیت تھیں جن کا شمار اُن چند ممتاز خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے تحریکِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ غیر معمولی فکر، گہری بصیرت، اور سماجی شعور کی حامل تھیں۔ آپ کے شوہر، فضل الحسن حسرت موہانی، تحریکِ آزادی کے نامور رہنما اور ایک عظیم شاعر تھے۔ بیگم نشاط النساء نے نہ صرف اپنے شوہر کے ساتھ تحریکِ آزادی میں بھرپور تعاون کیا بلکہ اُس دور کے ہندوستانی معاشرتی ڈھانچے کی اصلاح پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کو فروغ دینے اور انھیں ان کے حقوق سے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے عہد کی خواتین کو ان کے حقوق سے روشناس کرانے اور ان میں سماجی شعور بیدار کرنے کے حوالے سے ان کی خدمات بے حد قابلِ ستائش ہیں۔

نشاط النساء بیگم کی پیدائش 1885 میں موہان میں ہوئی جو ضلع اناؤ میں ایک قصبہ ہے۔ آپ کے والد کا نام سید شبیب حسن موہانی تھا، آپ پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل (ایڈوکیٹ) تھے اور حیدرآباد کے ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے زیادہ تر وقت حیدرآباد میں گزارتے تھے لیکن نشاط النساء بیگم موہان میں ہی رہیں۔ نشاط النساء اور مولانا حسرت موہانی کے جدامجد ایک ہی تھے، نشاط النساء حسرت موہانی کی پھوپھی زاد بہن بھی تھیں۔

اس دور میں عورتوں کی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی، اس لیے نشاط النساء بیگم رسمی مدرسے کی تعلیم سے محروم رہیں۔ لیکن آپ کی دادی ایک بردبار خاتون تھیں انھوں نے گھر پر ہی نشاط النساء بیگم کی تعلیم کا بندوبست کروادیا، جہاں انھوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی، اور عربی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی اس تعلیم نے انھیں تعلیم کی اہمیت اور سماجی شعور سے روشناس کرایا۔ اسی شعور کے تحت شادی سے پہلے ہی انھوں نے اپنے قصبے کی پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا شروع کر دیا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ خواتین کی تعلیم کی حمایت کرتی رہیں۔

نشاط النساء بیگم کی عمر تقریباً 16 یا 17 سال تھی جب 1901 میں ان کا نکاح حسرت موہانی سے ہوا۔ اس وقت حسرت ٹوپچج علی گڑھ میں ایف اے (فرسٹ آرٹس) کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شادی کے بعد کچھ عرصے تک بیگم حسرت موہانی اپنے آبائی قصبے میں رہیں، لیکن جب 1903 میں حسرت موہانی نے علی گڑھ میں اپنے رسالہ "اردوئے معلیٰ" کا اجرا کیا، تو انھوں نے علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اور وہاں اقامت اختیار کر لی۔ حسرت موہانی

نے نشاط النساء بیگم کو بھی اپنے پاس علی گڑھ بلا لیا، جہاں دونوں نے مل کر اپنی زندگی کو علم و ادب اور سماجی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

حسرت موہانی تحریک آزادی کے نامور علمبرداروں میں سے ایک تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر نشاط النساء بیگم کے سیاسی ذوق کو مزید تقویت ملی۔ حسرت موہانی اور بیگم حسرت ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ بیگم ان کی صرف شریک حیات ہی نہیں بنیں بلکہ شریک سیاست اور شریک ادب بھی بن گئیں۔ حسرت موہانی بھی ان کے اوصاف کے قائل تھے حسرت موہانی بیان کرتے ہیں:

''ہندوستان میں ایسے کم افراد ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کے برابر بھی قرار دے سکیں ان کی تمام باتوں کی تفصیل ایک جداگانہ تصنیف کی طالب ہے۔''

(مرتب عتیق صدیقی، بیگم حسرت موہانی اور انکے خطوط، جمال پریس، دہلی، ص 21)

بیگم حسرت کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کشن پرشاد کول کہتے ہیں۔

''ان کو ایک بات میں حسرت پر فوقیت حاصل تھی وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا وہ میرا اندازہ ہے کہ جب تک زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور رہا۔''

(کشن پرشاد کول، حسرت موہانی کی شخصیت، نگار، لکھنؤ، حسرت نمبر، صفحات 60,59)

مولانا نے خود اعتراف کیا ہے

''یہ تین نہ ہوتیں تو میں خود کسی اخبار کا ایڈیٹر ہوتا مولانا آزاد الہلال یا البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے انھوں نے جان دی لیکن ہم سے مطالبہ نہ کیا لیلیٰ سیاست کے پرستاروں تم تو جیل جا رہے ہو ہمارا کیا ہوگا۔''

(علیم اختر، حسرت موہانی، رسالہ جایزہ کانپور، ستمبر 1975 ص 64)

نشاط النساء بیگم صرف حسرت موہانی کے اوصاف کا عکس نہیں تھیں بلکہ خود ایک منفرد اوصاف کی جامع شخصیت تھیں۔ علی گڑھ آنے کے بعد آپ معاشرتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے بے بہرا نھیں رہیں، بلکہ علی گڑھ میں بیگم حسرت کے بیگم عبداللہ سے قریبی تعلقات رہے، جو اپنے شوہر شیخ عبداللہ کے ساتھ تعلیمِ نسواں کی کوششوں میں سرگرداں تھیں۔ جب 28 دسمبر 1905 کو علی گڑھ میں شاہ پور کی کوٹھی میں خواتین کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اس کانفرنس میں نشاط النساء بیگم نے نہ صرف شرکت کی بلکہ ایک پرجوش تقریر بھی کی۔ اس تقریر میں آپ نے تعلیمِ نسواں کی ترقی کے لیے کچھ تجاویز پیش کیں اور خواتینِ ہند سے ہر قسم کی مدد اور تعاون کی اپیل کی۔

''1907 میں بیگم حسرت کی اکلوتی بیٹی نعیمہ کی پیدائش ہوئی۔ ابھی نعیمہ کی عمر محض ایک سال اور چند مہینے تھی کہ مولانا حسرت موہانی کو ایک مضمون کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مضمون مصر میں مزدوروں کی تعلیم سے متعلق حکومت کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا گیا تھا اور رسالہ اردوئے معلیٰ میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کی یہ گرفتاری 1908 میں عمل میں آئی۔ اس وقت بیگم حسرت موہانی نہایت مشکل حالات سے گزر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ صرف ایک بیمار شیر خوار بچی اور ایک خادمہ تھی۔ تاہم، اس کٹھن گھڑی میں بھی بیگم حسرت موہانی نے ہمت اور صبر کا دامن تھامے رکھا۔ مولانا کی گرفتاری کے دوسرے ہی دن انھوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے مولانا کو ایک حوصلہ افزا خط لکھا''

''حسرت موہانی نے سدیشی تحریک میں بھی مولانا کی ہمنوائی کی اور ان کا ساتھ دینے کے لیے بدیشی لباس اور دیگر بدیشی اشیاء کا استعمال ترک کر دیا۔ اس دور میں تہذیب نسواں نے لکھا" سدیشی تحریک کے سلسلے میں

بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور مسز سرلا دیوی چودھری بڑی سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔"

(سید شفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی۔ حیات و سیرت، نشاط النساء میموریل سوسائٹی، کراچی 1994، ص 29)

1907 میں بیگم حسرت کی اکلوتی بیٹی نعیمہ کی پیدائش ہوئی۔ ابھی نعیمہ کی عمر محض ایک سال اور چند مہینے تھی کہ مولانا حسرت موہانی کو ایک مضمون کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مضمون مصر میں مزدوروں کی تعلیم سے متعلق حکومت کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا گیا تھا اور رسالہ اردوئے معلیٰ میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کی یہ گرفتاری 1908 میں عمل میں آئی۔ اس وقت بیگم حسرت موہانی نہایت مشکل حالات سے گزر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ صرف ایک بیمار شیر خوار بچی اور ایک خادمہ تھی۔ تاہم، اس کٹھن گھڑی میں بھی بیگم حسرت موہانی نے ہمت اور صبر کا دامن تھامے رکھا۔ مولانا کی گرفتاری کے دوسرے ہی دن انھوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے مولانا کو ایک حوصلہ افزا خط لکھا:

"تم پر جو افتاد پڑی ہے، اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا کوئی خیال نہ کرنا۔ خبردار، تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

(مرتب عتیق صدیقی، بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، جمال پریس، دہلی، ص 29)

حسرت موہانی کو قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ جب تک وہ علی گڑھ جیل میں قید رہے، بیگم حسرت موہانی ان سے باقاعدگی سے ملاقات کرتی رہیں۔ تاہم، جب مولانا کو نینی جیل منتقل کر دیا گیا تو ملاقاتوں کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس دوران بیگم حسرت موہانی نے نہ صرف اپنے عزم اور استقامت کا مظاہرہ کیا بلکہ حالات کا بہادری سے سامنا کیا۔

حسرت موہانی ایک سال جیل میں رہنے کے بعد جب رہا ہو کر علی گڑھ واپس آئے تو ان کے رسالے اردوئے معلیٰ کو کوئی چھاپنے کو تیار نہیں تھا۔ حسرت موہانی اور ان کی اہلیہ، بیگم نشاط النساء، ان لوگوں میں سے تھے جو حالات کے آگے جھکنے کے بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور نئے راستے نکالتے تھے۔ جب کسی نے رسالہ چھاپنے کی ذمّہ داری نہیں لی، تو انھوں نے اپنے گھر میں ہی کاٹھ دستی کا ایک چھوٹا سا پریس قائم کر لیا۔ اس پریس پر حسرت موہانی اور نشاط النساء بیگم خود محنت کر کے اردوئے معلیٰ چھاپتے تھے۔ انھوں نے اس پریس کا نام "اردو پریس" رکھا۔ تاہم، 1913 میں حکومت نے اس پریس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ رقم کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ پریس بند کر دیا گیا۔ 1916 میں حسرت موہانی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب نشاط النساء بیگم منظرِ عام پر آئیں۔ اس سے پہلے وہ زیادہ تر اپنے گھر تک محدود تھیں، لیکن مولانا کی گرفتاری کے بعد انھوں نے عملی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔

جب سکریٹری امورِ ہند، مانٹیگو، کو جنگ کے بعد ہندوستان میں اصلاحات کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے دورے پر بھیجا گیا تو انھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندہ وفود سے ملاقات کی۔ اس دوران خواتین کے ایک وفد کو بھی طلب کیا گیا، جس میں بیگم حسرت موہانی بھی شامل تھیں۔ اس ملاقات میں بیگم حسرت نے حکومت کی جانب سے کیے جانے والے مظالم کی سخت مذمت کی اور حسرت موہانی پر ہونے والے ظلم و ستم کی تفصیلات مانٹیگو کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے ان مسائل کے حوالے سے ایک تحریری یادداشت بھی پیش کی۔ اس موقع پر بیگم حسرت موہانی کے ہمراہ دیگر نمایاں خواتین رہنما جیسے مسز سرو جنی نائیڈو، مسز این دیوی، اور مسز اینی بیسنٹ وغیرہ بھی موجود تھیں۔

اس دوران نشاط النساء بیگم نے نہ صرف حسرت موہانی کی سیاسی جدوجہد میں ان کا بھرپور ساتھ دیا بلکہ ان کے مقدمات کی پیروی بھی دلیری اور ثابت قدمی سے کی۔ وہ اخبارات کے ذریعے

عوام کو حسرت موہانی کے خیالات اور حالات سے آگاہ کرتی تھیں۔
سید سلیمان ندوی کے مطابق، ''یہ وہ دور تھا جب بیگم نشاط النساء نے پردہ ترک کر دیا اور سادہ مگر باوقار لباس میں عوامی معاملات میں حصہ لینے لگیں۔ وہ اعتماد کے ساتھ باہر نکلتیں اور کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔''

(سید سلیمان ندوی، حسرت کی سیاسی زندگی، نگار، لکھنؤ، حسرت نمبر، ص 118)

جب سکریٹری امورِ ہند، مانٹیگو، کو جنگ کے بعد ہندوستان میں اصلاحات کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے دورے پر بھیجا گیا تو انھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندہ وفود سے ملاقات کی۔ اس دوران خواتین کے ایک وفد کو بھی طلب کیا گیا، جس میں بیگم حسرت موہانی بھی شامل تھیں۔ اس ملاقات میں بیگم حسرت نے حکومت کی جانب سے کیے جانے والے مظالم کی سخت مذمت کی اور حسرت موہانی پر ہونے والے ظلم و ستم کی تفصیلات مانٹیگو کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے ان مسائل کے حوالے سے ایک تحریری یادداشت بھی پیش کی۔ اس موقع پر بیگم حسرت موہانی کے ہمراہ دیگر نمایاں خواتین رہنما جیسے مسز سروجنی نائیڈو، مسز این دیوی، اور مسز اینی بیسنٹ وغیرہ بھی موجود تھیں۔

1918 میں حسرت موہانی کو رہائی ملی، اس کے بعد بھی بیگم حسرت سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم رہیں۔ وہ مولانا کے ساتھ مختلف سیاسی اجتماعات میں شرکت کرتی رہیں اور ان کے شانہ بشانہ آزادی کی تحریک میں بھرپور کردار ادا کرتی رہیں۔ 1919 میں دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اسی سال امرتسر میں خلافت کا اجلاس منعقد ہوا، دونوں اجلاسوں میں بیگم حسرت موہانی نے فعال شرکت کی۔ ان کے علاوہ، وہ خواتین کی تحریکوں میں بھی پیش پیش رہیں۔ اس دوران تحریکِ خلافت اپنے عروج پر تھی اور بیگم حسرت موہانی کی کوششوں نے مسلم خواتین کو اس تحریک کا حصہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی رہنمائی کی بدولت جلسوں میں خواتین کے لیے علیحدہ نشستوں کا اہتمام کیا جانے لگا، جہاں بی اماں اور بیگم حسرت موہانی کے ساتھ پردے میں موجود کئی مسلم خواتین شریک ہوتیں۔ بیگم حسرت موہانی کی سیاسی و سماجی خدمات نے برصغیر کی مسلم خواتین کو آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کی ترغیب دی اور ان کے دلوں میں قربانی، حوصلے اور استقلال کا جذبہ پیدا کیا۔

دہلی میں خدام خلافت کی انجمن قائم ہوئی تو مولانا کو اس کے سیکرٹری کے عہدے پر مقرر کیا گیا اور خواتین کی شاخ کی سیکرٹری کے طور پر نشاط النساء کو منتخب کیا گیا۔ مولانا نے 1920 میں علی گڑھ کی بجائے کانپور کو اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ کانپور میں سیاسی سرگرمیوں کے زیادہ مواقع میسر تھے۔ کانپور میں مولانا نے سرسید گھاٹ پر ایک ''سودیشی اسٹور'' قائم کیا، جو بعد میں کشن پور روڈ پر منتقل کر دیا گیا۔ 1920 میں کانگریس کے ناگپور اجلاس میں مولانا کی شرکت کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ بھی ان کے دوش بدوش شامل رہیں۔ ان اجلاسوں میں ''حصول سوراج'' (آزادی) کے مطالبے کو بھی ایجنڈے میں شامل کیا گیا۔

> **''بیگم حسرت موہانی صرف سیاسی جماعتوں کا حصہ نہیں رہیں بلکہ خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق تنظیموں میں بھی سرگرم رہیں۔ ان کے اس وقت کی مختلف سیاست میں فعال خواتین سے بھی تعلقات رہے جیسے سروجنی نائیڈو اور بی امّاں وغیرہ، بی امّاں سے تو ان کے بہت گہرے تعلقات رہے۔ ایک بار بی امّاں خواتین کی ایک کانفرنس کی صدارت کر رہی تھیں، اپنی صدارتی تقریر میں بی امّاں نے ان خواتین کو خراجِ تحسین پیش کیا جنھوں نے سیاسی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ان میں خود بیگم حسرت موہانی کا نام بھی شامل تھا۔''**

اسی سال، احمد آباد میں کانگریس، مسلم لیگ، کل ہند خواتین کانفرنس، کل ہند مزدور کانفرنس، اور کل ہند طلبا کانفرنس کے سالانہ اجتماعات منعقد ہوئے۔ یہ اجتماعات آزادی کی تحریک اور سماجی ترقی کے حوالے سے اہم سنگ میل ثابت ہوئے۔ مولانا کے نزدیک

سوراج (آزادی) کا مطلب کامل آزادی تھا اس کے مطلب کو واضح کردینا چاہیے جبکہ گاندھی جی سوراج کے مفہوم کو مبہم رکھنا چاہتے تھے۔ کانگریس کے ایک عام اجلاس میں اس تجویز کو پیش کیا گیا، لیکن آزاد سبحانی اور بیگم حسرت موہانی کے علاوہ کسی نے بھی سوراج کو کامل آزادی سمجھنے کی تجویز کی حمایت کرنے کی جرات نہیں کی۔

بیگم حسرت موہانی صرف سیاسی جماعتوں کا حصہ نہیں رہیں بلکہ خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق تنظیموں میں بھی سرگرم رہیں۔ان کے اس وقت کی مختلف سیاست میں فعال خواتین سے بھی تعلقات رہے جیسے سروجنی نائیڈو اور بی اماں وغیرہ، بی اماں سے تو ان کے بہت گہرے تعلقات رہے۔ ایک بار بی اماں خواتین کی ایک کانفرنس کی صدارت کررہی تھیں، اپنی صدارتی تقریر میں بی اماں نے ان خواتین کو خراج تحسین پیش کیا جنھوں نے سیاسی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ان میں خود بیگم حسرت موہانی کا نام بھی شامل تھا۔

احمد آباد میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں مولانا کی دی گئی تقریروں کے کچھ حصوں کی وجہ سے ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا، جس کے بعد انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت بیگم حسرت موہانی اپنی بیٹی نعیمہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں، لیکن مولانا کی گرفتاری کے بعد انھیں تمام فرائض اکیلے انجام دینے پڑے۔ شادی کے بعد بیگم حسرت موہانی کے مقدمے کی پیروی میں مصروف ہوگئیں اور اس سلسلے میں الٰہ آباد اور بمبئی میں قیام کیا۔ اس مقدمے کے نتیجے میں مولانا کو دو سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اس دوران بیگم حسرت موہانی نے بہت سی مشکلات کا بہادری سے سامنا کیا اور اپنے عزم و ہمت کی مثال قائم کی۔ اخبارات اور رسائل کو بروقت اطلاع فراہم کرنے کی ذمے داری اس بار بھی بیگم حسرت کے سپرد تھی۔ اس طرح بیگم حسرت نے ایک بار پھر ان کے معاون اور رابطہ کار کے فرائض انجام دیے۔

بیگم حسرت موہانی کی شخصیت کو تمام سیاسی حلقوں میں پہچانا جاتا تھا۔ وہ 1921 میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی رکن بن چکی تھیں اور کمیٹی کے اجلاس میں باقاعدگی سے شریک رہتی تھیں۔

دسمبر 1922 میں کانگریس کا اجلاس بہار کے شہر گیا میں منعقد ہوا، جس میں بیگم حسرت نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں بیگم صاحبہ نے عدم تعاون کے حوالے سے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''مکمل آزادی کے جو لوگ علمبردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ البتہ، جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا چاہتے ہیں وہ کونسلوں میں جاکر آئینی اصلاحات کی قسطیں وصول کر سکتے ہیں۔''

(مرتب عتیق صدیقی، بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، جمال پریس، دہلی، ص 42)

غالباً یہ پہلی تقریر تھی جو کسی مسلم خاتون نے کانگریس کے اجلاس میں دی تھی۔

مولانا 14 اپریل 1922 کو گرفتار ہوئے اور 13 اگست 1924 کو رہا ہو گئے۔ 1925 میں، جب کانپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا، مولانا حسرت موہانی مزدوروں کی رہنمائی کرتے ہوئے پنڈال تک پہنچے تاکہ کانگریس کے لیڈروں کو مزدوروں کے مسائل سے آگاہ کر سکیں۔ اس دوران کانگریس کے رہنماؤں اور حسرت موہانی کے درمیان کچھ کشمکش پیدا ہوگئی، اس کے بعد حسرت موہانی اور ان کی اہلیہ بیگم حسرت موہانی نے ہمیشہ کے لیے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا۔

اس کے بعد بیگم صاحبہ کی طبیعت ناساز رہنے لگی، جس کی وجہ سے وہ عملی سیاست میں زیادہ حصہ نہ لے سکیں۔ حسرت موہانی کے ساتھ وہ 1932 سے 1936 تک مسلسل ہر سال حج پر گئیں۔ بیگم حسرت موہانی طویل علالت کے بعد 8 اپریل 1937 کو انتقال کرگئیں۔

مولانا نے مئی 1937 کے شمارے میں اردوئے معلی میں لکھا

> ''ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی باتوں میں بیگم اس سے (حسرت موہانی) سے بہت بہتر تھیں اس لیے ہر طرح کی تنبیہ کا حق تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔

(مرتب عتیق صدیقی، بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، جمال پریس، دہلی، ص 50)

❑❑❑

Dr. Razia Sultana

Lal Diggi, Iqbal Bagh

Civil Line

Aligarh-202001 (U.P)

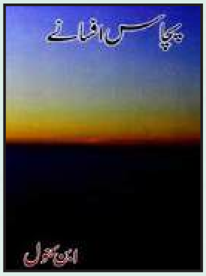

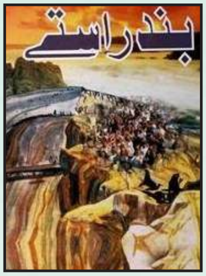

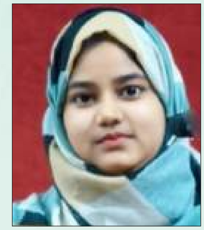

محسنہ نگار

ابن کنول

کے افسانوں میں داستانوی اثرات

آٹھویں دہائی کے ممتاز ادیبوں میں ابن کنول اپنے منفرد لب ولہجہ کے سبب اردو ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کا نام اردو افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔وہ ایک معروف ادیب، محقق، ناقد، افسانہ نگار، خاکہ نگار، ڈرامہ نویس، انشائیہ پرداز، مفکر، شاعر، مضمون نگار اور درجنوں کتابوں کے مرتب کے ساتھ ہر دل عزیز استاذ بھی ہیں۔ مابعد جدید افسانہ نگار ابنِ کنول نے اردو افسانہ نگاری کو اس کی حقیقی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں انھوں نے سادہ عام فہم زبان میں افسانے لکھ کر عام قارئین کو متاثر کیا تو وہیں اپنے افسانوں کے ذریعہ قدیم کلاسیکی ادب کی اہمیت و افادیت سے متعارف کر قارئین کو قدیم و جدید ادب سے جوڑے رکھنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ پروفیسر ابنِ کنول کا اندازِ بیان اور موضوعات ان کے معاصرین افسانہ نگاروں سے کافی مختلف ہیں۔انھوں نے اپنا رشتہ ادب کی کلاسیکی روایات سے قائم کرتے ہوئے جدید افسانوی ادب اور اس کے تقاضوں کو کسی طرح مجروح نہیں کیا۔

ابنِ کنول کے افسانوں کے تین مجموعے ''تیسری دنیا کے لوگ'' 1984، ''بند راستے'' 2000 اور ''پچاس افسانے'' 2014 میں شائع ہو چکے ہیں۔گذرے چھ دہائیوں میں ابن کنول کی کم وبیش ساٹھ سے زائد کہانیاں ملک و بیرون ملک کے معروف رسائل وجرائد میں شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ابن کنول نے ابتدائی ادبی زندگی میں شاعری کی، مگر انھوں نے اپنے احساسات کی ترجمانی افسانوں میں کی اور باقاعدہ طور پر اپنے افسانے کو احساسات کا ذریعے بنایا۔ چونکہ یہ صنف ادب ان کے مزاج سے زیادہ قریب تر تھا۔ابنِ کنول کے افسانوں میں عہد حاضر کے عصری حالات اور پیچیدہ مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی حقیقی تصویر کشی ملتی ہے۔ابن کنول کے افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ انفرادیت کی حامل ہے وہ ہے ان کا داستانوی رنگ و آہنگ ہے۔بعض ناقدین ابنِ کنول کی افسانہ نگاری پر داستانوی رنگ آمیزی کو انتظار حسین سے متاثر ہونا بتایا ہے۔لیکن ابنِ کنول اس بات سے انکار کرتے ہیں اور اس کا سبب براہ راست داستانوں کا مطالعہ کو بتاتے ہیں اور قصہ سے قصہ نکالنے کا ہنر بھی اسی سے سیکھا ہے۔

ابن کنول داستانوں کے ایک معتبر محقق اور ناقد ہیں۔ داستان

ان کی محبوب صنف ادب رہی ہے اور اس کا شوق انھیں ورثے میں ملا تھا، اسی سبب ان کی لفظیات پر داستانوی لب ولہجہ حاوی ہے۔ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ بھی داستان پر ہی قلم بند کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستان پر انھیں کس قدر عبور حاصل تھا۔ ان کے معاصرین اور نئے دور کے لکھنے والوں میں حسین الحق، سلام بن رزاق، عبدالصمد، انور خان، قمر احسن، سید محمد اشرف، شوکت حیات، غضنفر، ساجد رشید اور انجم عثمانی وغیرہ نے افسانوں میں کسی نہ کسی شکل میں داستانوی طریقۂ اظہار کو اپنایا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے مختلف طریقوں سے داستانوں سے استفادہ کیا ہے۔ ابن کنول نے بھی اپنی کہانیوں میں داستانوی فضا اور رنگ بھرنے کے لیے تقریباً سبھی انواع اپنائی ہیں اور جس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ عام طور پر ان کے افسانوں کا آغاز بھی داستانوی زبان سے ہی ہوا ہے ''جیت کسی کی ہار کسی کی''، ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ''، ''وارث''، ''پہلا آدمی''، ''سویٹ ہوم'' ایسے افسانے ہیں جن کا آغاز داستانوی زبان سے ہوتا ہے۔

ابن کنول نے اپنے افسانوں میں داستانوی رنگ بھرنے کے لیے داستانوی لب ولہجہ، مسجع اور پرشکوہ الفاظ وعبارات کا استعمال عمدگی سے کیا ہے۔ ان کے داستانوی انداز میں عہد حاضر کی سیاسی سماجی، اور ثقافتی زندگی کے ساتھ انسان کی داخلی زندگی اور نفسیات کی حقیقی عکاسی بھی ہے۔ ان کے افسانے عصری اضطراب اور انسانی کشمکش کے پیچ وخم کے غماز ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں داستانوی رنگ لیے جملے ایک طلسمی فضا پیدا کر کے کہانی کو مزید رنگین بنا دیتے ہیں جس کو پڑھ کر قاری جملوں کی جادوئی دنیا میں کھو جاتا ہے لیکن جلد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی حقیقی دنیا کی طرح مسائل ہیں۔ یہاں بھی حالات کے مارے بے بس، لاچار اور بھوکے پیاسے لوگ رہتے ہیں، جس سے کہ ان کی آپ بیتی، جگ بیتی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ قاری رنگین دنیا میں ہوتے ہوئے بھی ان کے حقیقی مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ بلاشبہ ابن کنول کے افسانوں کا خاصہ بھی یہی ہے۔ کہ انھوں نے داستانوی فضا میں حقیقت نگاری کو پرویا ہے۔ اس سے افسانے میں وہ عناصر صاف طور سے دیکھائی دیتے ہیں جو ان کی خصوصیت رہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی میراث ہماری داستانوں میں جھلکتی ہے۔ 1980 سے قبل وہ کہیں گم سی تھی لیکن ابن کنول جیسے تخلیق کاروں کی جستجو نے افسانوں کی شکل میں ہمیں پھر سے ہندوستانی تہذیب سے روشناش کرایا۔ ابن کنول کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' نویں دہائی میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے داستانوی اسلوب ومحرکات میں ڈوبے ہوئے ہیں جو ان کا خاص انداز بیان ہے۔ قمر رئیس بھی ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر ان کے افسانوں سے بجاطور پر متاثر ہیں۔

ابن کنول کے افسانوں میں داستانوی اثرات عمداً ہیں۔ لیکن ان کے بعد کے افسانوں میں یہ اثرات ذرا ماند پڑ گئے ہیں۔ انھوں نے دوسرے افسانوی مجموعے ''بند راستے'' میں داستانوی رنگ سے ہٹ کر جدید تکنیک اور نئے اسلوب کی طرف رخ کیا۔ ان افسانوں میں عصری دور کے سیاسی نظام کی خرابیاں اور اس کے سبب پیش آنے والے سماجی مسائل اور خانگی الجھنوں کی متحرک تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

ابنِ کنول کے بعض افسانوں کے پلاٹ داستانوی اثرات کے سبب اساطیری روایات سے پر اثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''صرف ایک دن کا فاصلہ'' میں اصحاب کہف کا واقعہ، ''سویٹ ہوم'' میں حضرت ابراہیم کا واقعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' میں تین سو تیرہ والے واقعات کی تلمیح ''پہلا آدمی'' افسانہ ''ایک ہی راستہ'' میں وردان اور سویٹ ہوم میں ابابیلوں کی تلمیح کا استعمال کر ابنِ کنول اپنے افسانوں کو نیا موڑ دیتے ہیں۔ افسانوں میں ان واقعات کو استعمال کرنے کا مقصد بدی کے خلاف لڑنا اور جدو جہد کا درس دینا ہے۔ اساطیری اسلوب وزبان کے ساتھ ہی ابنِ کنول نے بعض افسانوں کے کرداروں کے نام بھی اسلامی روایات کے مدِ نظر رکھے ہیں مثلاً ''جیت کسی کی ہار کسی کی'' میں یوسف کردار کا نام حضرت یوسفؑ کے نام پر، افسانہ ''وارث'' میں ابوعقیل، خردمند، جانباز خان اور ابوشاطر اور افسانہ ''صرف ایک شب کا فاصلہ' وغیرہ کے کرداروں کا انتخاب ان کے اعمال وصلاحیتوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ ابنِ کنول نے '' آنکھوں کی سوئیاں'' اور ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' وغیرہ

بعض افسانوں کے نام بھی داستانوی طرز پر رکھے ہیں۔

ابن کنول نے کہانیوں میں داستانوی زبان و اسلوب کا استعمال کرتے ہوئے اس طرف توجہ دی ہے کہ زمانہ اگر چہ تبدیل ہو چکا ہے لیکن ہمارے حالات میں کوئی تغیر نہیں آیا ہے۔حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں جیسے کہ ان کے افسانے ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ''،''صرف ایک شب کا فاصلہ''،''وارث''اور''صرف ایک دن کے'' افسانوں میں عصری حالات کے سیاسی سماجی پس منظر کو دیکھتے ہوئے تخلیق کیے گئے ہیں جو داستانوی طرز تحریر کردہ قدیم سیاسی حالات سے مماثلت رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر افسانہ''صرف ایک شب کا فاصلہ'' داستانوی فضا میں تخلیق کیا گیا ہے لیکن اس میں ایمرجنسی کے وقت اور حالات کو پیش کیا گیا ہے۔افسانے کا خمیر اصحاب کہف کے واقعے سے لیا گیا ہے لیکن اس میں حالات و مسائل عصر حاضر کے ہیں۔عتیق اللہ نے اردو اکیڈمی کے ایک سمینار میں''ابنِ کنول کا پس حقیقت کو کسب کرنے کا فن''مضمون میں ان کے افسانوں کو''سیاسی طنز''سے مماثلت دی ہے۔

کہانی یا قصہ نکالنا داستانوی ادب کا ایک خاص اسلوب ہے۔ابنِ کنول کے افسانوں کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں قصہ گوئی کی عمدہ مثال ملتی ہے جو انھوں نے داستانوی اثرات کے سبب اختیار کی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے ان میں مزید دلچسپی و جاذبیت بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کی بہترین مثال''جیت کسی کی اور ہار کسی کی''،''خوف''،''مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی''،''شام ہونے سے پہلے''اور''قصہ صرف کتابوں کا''وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں کہانی کو جوڑ کر افسانے کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے یا پھر اسی کہانی پر افسانے کا پلاٹ بنا گیا ہے۔

افسانے میں داستانوی طرز تحریر قطعی آسان کام نہیں ہے۔اس کے لیے داستانوی فنی کاوشوں، گہری نظر اور وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے۔ابنِ کنول کا ماننا ہے کہ موضوع اپنی ٹیکنیک کا انتخاب خود کر لیتا ہے۔کچھ لوگوں نے داستان طرازی کو سہل پسندی کا نام دیا ہے۔ان لوگوں کے لیے ابن کنول نے ایک مضمون میں یہ جواب دیا ہے کہ:

''یہ کہنا سراسر بد دیانتی ہے کہ داستان طرازی آسان فن ہے۔دوسرے جن افسانہ نگاروں نے داستانوی طریقہ اظہار کو اختیار کیا ہے انہوں نے بیشتر افسانے اس تکنیک سے ہٹ کر لکھے ہیں۔دراصل موضوع خود بخود ٹیکنیک اختیار کر لیتا ہے اور افسانہ نگار کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ اپنی بات کہنے کے لیے کس طرز اظہار کو اپنایا جائے جو موضوع کا حق بھی ادا کردے اور متاثر کن بھی ہو۔''(داستان سے ناول تک،ابن کنول،ص179)

ابن کنول کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں داستانوی رنگ و آہنگ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔یہی خصوصیت انھیں تمام افسانہ نگاروں سے منفرد کرتی ہے۔ابن کنول کی تمام تخلیقات ہمارے دور کے تمام حقائق کو پیش کرتی ہیں۔ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ابنِ کنول کے افسانے نہ صرف قاری کے ذہن کو بیدار کرتے ہیں بلکہ ان میں جوش ولولہ،نئی سوچ،حرکت و عمل میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔لیکن ان کے افسانوں میں استعمال جدید تکنیک،اچھوتا پن،نئی تازگی اور توانائی کا راز ان کے مطالعۂ داستان میں مضمر ہے لیکن جس خاص طرز تحریر کی بدولت انھیں مابعد جدید افسانہ نگاروں میں اولیت حاصل ہے وہ ہے ان کا داستانوی اسلوب و زبان۔داستانوی اثرات کے سبب ہی ان کے افسانوں کی زبان میں روانی اور مٹھاس ہے۔

❑❑❑

Mohsina Nigar
Research Scholar
Dept. of Urdu
M.H. P G College Moradabad
Supervisor Dr. Abdur Rab
Mohalla Gher,
Near Jama Masjid Town
Post Sirauli, Tehsil Aonla
District Bareilly-243303 (U.P)

صبیحہ شمیم

لطف الرحمٰن کا رنگِ تغزل

"بوسۂ نم" کے حوالے سے

صوبہ بہار اپنی گونا گوں خاصیت کی وجہ سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں ایک منفرد اور خاص مقام رکھتا ہے۔ اس سرزمین پر بڑے بڑے شجاع، قلندر، ادیب وشاعر پیدا ہوئے۔ انھوں نے سرزمین بہار کو عزت وشہرت بخشی۔ اردو زبان وادب کا بھی یہاں خوب فروغ ہوا۔ یہاں کے ادبا وشعرا نے بھی اپنی اپنی تخلیقات سے اپنی مادری زبان اردو کو سجایا سنوارا، اس کا مستقبل روشن کیا۔ علامہ جمیل مظہری، شاد عظیم آبادی، کلیم عاجز، کلیم الدین احمد، وہاب اشرفی، شمس الرحمٰن فاروقی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، قمر جہاں، مناظر عاشق ہرگانوی، شموئل احمد، لطف الرحمٰن وغیرہ وغیرہ بہار کے گوہر نایاب ادبا وشعرا کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان تمام شخصیات نے اپنی ذہنی کاوشوں سے، اپنی سوچ وفکر سے، اپنے نوکِ قلم سے صفحہ قرطاس پر ایسے ایسے انمول خزانے بکھیرے ہیں کہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں انکا نام ہمیشہ سنہرے لفظوں سے لکھا جائے گا۔

لطف الرحمٰن کا شمار ریاست بہار کے باشعور شاعر وادیب کے طور پر ہوتا ہے۔ وہ اردو کے ایک معتبر اور منفرد ناقد تو ہیں ہی، ہمارے عہد کے مقتدر اور قادرالکلام شاعر بھی ہیں۔ ان کے شعری کائنات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں بھرپور اور کامیاب طبع آزمائی کی ہے، لیکن میرا موضوع چونکہ "لطف الرحمٰن کا رنگِ تغزل بوسۂ نم کے حوالے سے" ہے۔ اس لیے میں صرف ان کے رنگِ تغزل کو ہی زیر بحث بناؤں گی۔ لطف الرحمٰن غزل کے ایک ایسے باکمال شاعر ہیں جن کے یہاں تغزل کا رنگ ایک ایک شعر پر غالب نظر آتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری میں جدیدیت یا عصری آگہی کا فقدان ہے۔ موصوف کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے تہذیب غزل کا بھرپور دھیان رکھا ہے۔ انھیں لفظوں اور لفظوں سے بھی آگے یعنی معنی ومفہوم کی سطح پر بھی اپنے اسلوب کی گلکاریوں کا مظاہرہ کرنا خوب آتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی سے جو بھی تجربات حاصل کیے ہیں ان میں فکری و شعوری میلان کا عکس نمایاں ہے۔ وہیں عہدِ حاضر کی سیاسی سماجی و تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ لطف الرحمٰن کی شاعری پہلو بہ پہلو تروتازہ شگفتہ اور شاداب لفظیات کا دلکش نگارخانہ ہے۔ بقول فخر الدین عارفی۔

"لطف الرحمٰن کی شاعری میں بھرپور جمالیات موجود ہیں۔ وہ الفاظ کے ایک ایسے جادوگر ہیں جن کے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ خوب صورت

الفاظ کو وہ غزل کے پیکر میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں
کہ ان کے غزل کے آئینے میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ
بہت متنوع اور رنگا رنگ ہوتی ہے۔ ایک ایسا پیکر ابھرتا
ہے جس کے ہونٹوں پر کبھی ہم مسکراہٹ کے گلاب کھِلتے
ہوئے دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں ہمیں
آنسوؤں کے برقی قمقمے جلتے بجھتے نظر آتے ہیں۔''

(لطف الرحمٰن۔فن اور شخصیت،ص۔174)

اردو میں حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت ملتی ہے ۔ بیشتر شاعروں نے حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے ذریعے اپنے معبود حقیقی کی قدرت اور لامحدودیت ، اور سرورِ کائنات کے ساتھ اپنے قلبی لگاؤ کا برملا اظہار کیا ہے۔ لطف الرحمٰن ایک راسخ العقیدہ شخصیت تھے۔ انھوں نے مخصوص و منفرد رنگ میں خوبصورت حمدیہ اشعار کہہ کر مالک حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق استوار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی غزلوں کا مجموعہ ''بوسۂ نم'' کی شروعات کی ہے۔ جہاں وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل اور رفیع بصیرتوں کے ساتھ مالک حقیقی سے نہایت مؤدبانہ انداز میں طالب ہیں۔''

اردو میں حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت ملتی ہے ۔ بیشتر شاعروں نے حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے ذریعے اپنے معبود حقیقی کی قدرت اور لامحدودیت ، اور سرورِ کائنات کے ساتھ اپنے قلبی لگاؤ کا برملا اظہار کیا ہے ۔ لطف الرحمٰن ایک راسخ العقیدہ شخصیت تھے ۔ انھوں نے مخصوص و منفرد رنگ میں خوبصورت حمدیہ اشعار کہہ کر مالک حقیقی کے ساتھ اپنے تعلق استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی غزلوں کا مجموعہ ''بوسۂ نم'' کی شروعات کی ہے۔ جہاں وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل اور رفیع بصیرتوں کے ساتھ مالک حقیقی سے نہایت مؤدبانہ انداز میں طالب ہیں۔

میں چپ ہوں بڑی دیر سے اب تابِ اثر دے
لہجے کو میرے نرمی رخسارِ سحر دے

ہر لفظ میں ہے صبح کے پھولوں کی حلاوت
ہر حرف کو کلیوں کی حکایت کا ہنر دے

تخئیل کو دے نرم ستاروں کی خنک چھاؤں
افکار کو سنجیدگی رنجِ سفر دے

احساس کو رِستے ہوئے زخموں کی امانت
اشکوں کو پگھلتی ہوئی موجوں کا بھنور دے

خوشبو بھی ٹھہر جائے وہ اسلوب عطا کر
پتھر بھی پگھل جائے وہ اعجاز ہنر دے

ہر ظلم کی جاگیر میں ذلت کو رقم کر
مظلوم کے ہاتھوں میں بھی شمشیر و سپر دے

غزل نے اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کے ساتھ ہی اِرتقاء کی منزلوں کو طے کیا۔ اس لمبے سفر میں اس نے نہ جانے کتنی بار بلندیوں کو عبور کیا اور کتنی بار کھائیوں میں اوندھے منہ گری اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ ہر دفعہ زمانے کے سرد و گرم سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے خود کو سجایا سنوارا اور پھر ایک نئے سفر کی طرف نکل گئی۔ اس سفر میں اس پر نہ جانے کتنے اعتراضات کے تیر چلائے گئے تو وہیں دوسری طرف اعتراف کے پھول بھی برسائے گئے۔ رشید احمد صدیقی نے اسے اردو شاعری کی آبرو، نیاز فتح پوری نے روح ، تو اختر اورینوی نے تصویروں کا نگار خانہ اور فراقؔ نے عطر کہا ہے۔ وہیں بعض نقادوں نے کھل کر اس کے خلاف معاندانہ رویہ بھی اختیار کیا۔ کلیم الدین احمد نے نیم وحشی

صنفِ سخن، حالی نے بے وقت کی راگنی، تو عظمت اللہ خان نے اس کی گردن ہی بے دریغ مار دینے کی بات کی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی صنف پر کی گئی تنقید ہی اس کے حُسن میں نکھار پیدا کرتی ہے۔

"آج اگر اکیسویں صدی میں ہم غزل کی مقبولیت کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ روز اول کی طرح غزل آج بھی اپنے پُروقار شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہے ۔ حالانکہ غزل کہنے والوں کی کمی تو نہیں لیکن آداب غزل کو اداکرنے والوں کی بات کریں تو ایسے شاعر بہت کم ملتے ہیں۔ لطف الرحمٰن کے شعری مجموعہ "بوسۂ نم" کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فکر و احساس کی تازگی اور شعور آگہی کی روشنی سے یہ مجموعہ پُر ہے ۔ ان کی شاعری میں ابہام و اہمال کہیں بھی نہیں ۔ انھوں نے زندگی کو جس شکل میں دیکھا ، محسوس کیا اس کا برملا اظہار کر دیا۔"

آج اگر اکیسویں صدی میں ہم غزل کی مقبولیت کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ روز اول کی طرح غزل آج بھی اپنے پُروقار شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ حالانکہ غزل کہنے والوں کی کمی تو نہیں لیکن آداب غزل کو ادا کرنے والوں کی بات کریں تو ایسے شاعر بہت کم ملتے ہیں۔ لطف الرحمٰن کے شعری مجموعہ ''بوسۂ نم'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فکر و احساس کی تازگی اور شعور آگہی کی روشنی سے یہ مجموعہ پُر ہے۔ ان کی شاعری میں ابہام و اہمال کہیں بھی نہیں۔ انھوں نے زندگی کو جس شکل میں دیکھا، محسوس کیا اس کا برملا اظہار کر دیا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے راست شاعری کو ہی اپنے شعری اظہار کا جزو لاینفک قرار دیا ہے، بلکہ ان کے شعری پیرائے میں نفاست اپنے پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے، جس کی تصدیق اس چھوٹی سی غزل سے کی جاسکتی ہے۔ دیکھیے:

اک غریب شہر کو اتنی بھی رسوائی نہ دے
زخم گہرا دے، مگر زخموں کو گویائی نہ دے

میں اکیلے پن کا سناٹا بکھیرتا جاؤں گا
جانے والے تو مجھے صحرا کی تنہائی نہ دے

ڈوب کر جس میں نہ ابھرے کوئی بیمارِ سحر
سینۂ شب کو میرے مالک وہ گہرائی نہ دے

میں نقابوں میں چھپے چہروں کو سمجھا ہی نہیں
میری آنکھوں کو ابھی الزام بینائی نہ دے

چار اشعار پر مشتمل بظاہر یہ ایک چھوٹی سی غزل ہے۔ مگر یہ اشعار شاعر کے کرب ناک احساسات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ سماج کا کھوکھلا پن، خودغرضی اور رشتوں میں ریاکاری، گردوپیش کے واقعات حادثات ان کے تجربے اور مشاہدے اس کا بین ثبوت ہیں کہ شاعر کس کرب سے گزر کر اپنے جذبوں کو شعری پیکر میں ڈھالتا ہے۔ انسانی ناقدری کے خلاف لب کشا ہوتا ہے۔ ان کی اسی خاصیت کی بنا پر شفیع جاوید فرماتے ہیں:

''لطف الرحمٰن ۔۔۔۔ کے اشعار داخلی حقیقتوں کے وہ نامے جو خامۂ خونچکاں سے اور فگار انگلیوں سے لکھے گئے ہیں۔ ان کے یہاں حزن آگیں کیفیتیں اور آگہی کی ایسی روشن منزلیں آتی ہیں جو یہ تاثر دیتی ہیں کہ بات اتنی ہی نہیں، اس کے پرے بھی کچھ اور ہے کیوں کہ تجربات اور واردات کا بحر بے کنار تو اس طرح ہے کہ اسے طے کر لینا آسان نہیں۔۔۔۔''

(دشت میں خیمۂ گل، ص۔25)

ترقی پسند تحریک کے بعد ادب کا معیار بدلا۔ شعری اور افسانوی دنیا میں بے انتہا وسعت پیدا ہوئی۔ یہ حسن وعشق کے تانے بانے سے نکل کر زندگی کے تلخ و شیریں حقیقتوں سے روبرو ہوئی۔ مگر

پھر بھی آج جب غزل کا نام لیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم ہی عاشق و معشوق، ہجر و وصال، شکوہ و شکایت سے لیا جاتا ہے۔''بوسۂ نم'' کے نام سے ہی قاری یا سامع کا ذہن عشق کے گلیاروں میں گردش کرنے لگتا ہے۔ اس کے لیے غزل مشہور بھی ہے اور بدنام بھی۔ مگر''بوسۂ نم'' کے شاعر کا مقصد یکسر مختلف ہے۔ اس کا اظہار مصنف نے خود مجموعے کے آغاز میں''حرف وحکایت کے درمیاں'' کے عنوان سے کیا ہے۔ جو ان کے عنوان کی وجہ تسمیہ کو سمجھنے میں معاون ہے۔

''بعض بزرگوں کے مطابق جو آنسو درد و غم اور رنج و محن کا ذریعہ اظہار بنتا ہے۔ اس کا مزہ نمکین ہوتا ہے اور جو خوشی و مسرت اور نشاط و شرشاری کا وسیلۂ اظہار بنتا ہے۔ اس کا مزہ شیریں ہوتا ہے۔ اس نہج سے اظہار کے مرحلوں میں شاعر کا تجربہ تلخ و شیریں کی ایک الگ کیفیتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور مژۂ چشم سے بے ساختہ بہتے ہوئے آنسوؤں کی دھار اس کے لبوں کو چومتی ہے تب شاعر ایک ایسے اسلوب سے آشنا ہوتا ہے جو''بوسہ نم'' سے عبارت ہے۔۔۔''

(''بوسۂ نم'' حرف وحکایت کے درمیاں، ص۔7)

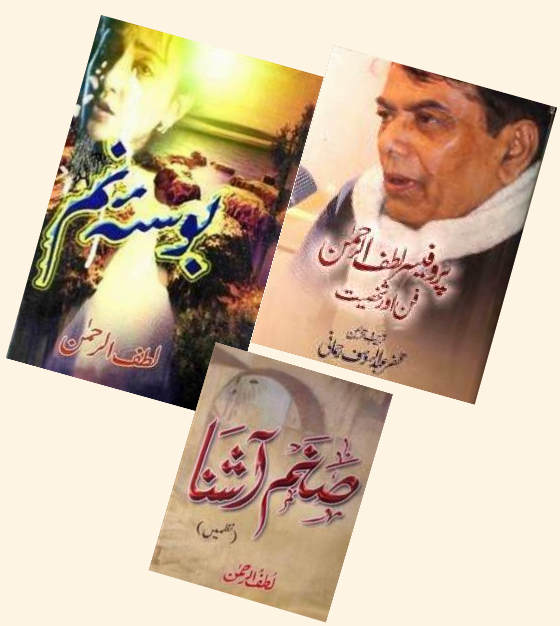

''بوسۂ نم'' ایک باشعور، دردمند اور مخلص شاعر کا ذاتی تخلیق ہے۔ اس نے افسردگی اور ویرانی کے بیچ زندگی گزاری۔ جہاں تنہائیوں نے اپنا ڈیرہ جما رکھا ہے۔ دور دور تک کوئی ہمنوا کوئی ہمراہ نہیں۔ زندگی کی اسی المنا کی سے موصوف نے''بوسۂ نم'' کی غزلوں کا خمیر تیار کیا ہے۔ لطف الرحمان کے یہاں تنہائی اور اس کی پیدا کردہ کیفیات کا شدید احساس جابجا بیان ہوا ہے۔ مگر بوسۂ نم کا شاعر تنہائی سے خوف زدہ نہیں، بلکہ وہ اسے اپنا رفیق بنالیتا ہے۔ چنانچہ یہ احساس اپنی گونا گوں صورتوں کے ساتھ ان کے یہاں موجود ہے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمایے:

سناٹا پہرہ دیتا ہے
تنہائی گھر میں سوتی ہے
ہر طرف اک آشنا بیگانگی اچھی لگی
اجنبی تنہائیوں کی دوستی اچھی لگی

مجھ کو کھینچے لیے جاتی ہے سُوے بزمِ طرب
مجھ سے گھبرا گئی شاید مری تنہائی بہت

دل کی سلطنت کیا ہے ایک شہرِ تنہائی
کون ہم سا ہوگا اب طرز کج کلاہی میں

آج تنہائی در و بام پہ دیکھی نہ گئی
سو گئی ساتھ گلے لگ کے ہمارے جیسے

چلا گیا ہے کوئی چھوڑ کر ہمیں تنہا
ہم اپنے شہر میں رہتے ہیں بے وطن جیسے

''بوسہ نم'' کی غزلیں لطف الرحمٰن کے مختلف مشاہدات اور جذبات سے مشتق ہیں۔ لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا پورا مجموعۂ کلام پڑھ جایئے آپ کو کہیں بھی غیر سنجیدگی اور غیر شائستگی کا احساس نہیں ہوگا بلکہ ایک مخصوص فضا سے آشنائی ہوگی۔ جس میں تخلیقی پہلو کے ساتھ ساتھ اخلاقی پہلو کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی اور

سلاست کے ساتھ مختلف موضوعات کو اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ کریں۔

وہ میرے ساتھ رہا ابر گریزاں کی طرح
درد کی دھوپ میں جلتا رہا سایہ میرا

آسمانوں سے ابابیل کے لشکر اتریں
امتحاں پھر سے تیرا گھر ہے خدایا میرا

ہر مصر میں بکتی ہے زلیخا میرے مولا
ہر مصر کو اک یوسفِ کنعانِ دگر دے

پھر وہی معرکۂ کرب و بلا ہے کہ جو تھا
سینۂ حق ہے وہی ، ظلم کا خنجر ہے وہی

اسی دائرے میں سمٹ گئیں مری کائنات کی وسعتیں
تیری جستجو ، تیری جستجو ، تیری جستجو

چاند نے کیا جانے کیا جھک کے سمندر سے کہا
ایک اک قطرہ اُٹھا ہے بے کراں ہوتا ہوا

لطف الرحمٰن کے ان اشعار سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک متناسب تراشے ہوئے اور ہشت پہلو ہیرے کا تصور ہیں جو رنگ و آہنگ، خطوط اور آوازوں، صورت ومعنی کا روشن پیکر ہیں۔ یہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہ اشعار ڈکشن ، مواد ، ہیئت ، اسلوب اور تکنیکی اعتبار سے بالکل منفرد ہیں۔ عمدہ تشبیہات ، تمثیلات ، عام فہم اور دلنشیں الفاظ وتراکیب کے استعمال سے یہ اشعار قاری کے دل کے تاروں کو چھو لیتے ہیں۔ لطف الرحمٰن کا شمار اگر غزل کے اُن باکمال شعرا میں کیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا، جنھوں نے غزل کے تمام لوازمات کو بہ خوبی برتا ہے۔ یہ صنفِ غزل کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار شاہکار نظر آتے ہیں۔ چند اشعار پیشِ نظر ہیں۔

جس کو تیری ہم رکابی کا شرف حاصل رہا
رشک کے قابل جہاں میں ہے تو بس اس کا سفر

مچاؤ شور مت صحرا میں اتنا
کہیں مجنوں ابھی سویا تو ہوگا

اتنے تارے فلکِ دشت پہ روشن کب تھے
ایک اک داغ ہوا آج ہویدا میرا

سب نے مل کر دامنِ یوسف کے پُرزے کردیے
کس قدر دشمن ہے دنیا عظمتِ کردار کی

بہر حال ''بوسۂ نم'' کی غزلوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لطف الرحمٰن خیالی دنیا میں بھٹکنے والا شاعر نہیں، بلکہ وہ حقیقت کی دنیا میں چہل قدمی کرتا نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں جو تخلیقی کیفیت ملتی ہے وہ شعوری اور لاشعوری تجربے کا ناگزیر حصہ ہے۔ یہ خود مرتکز وحدت میں ڈھلنے کی کیفیت ہے ساتھ ہی الہامی عمل ہے، جس کے تحت تخلیقی فضا میں بے نام احساساتی کوائف وواردات ، مرئی اور متحرک پیکروں میں نمو کرتے ہیں۔ یہ پیکر بنائے نہیں جاتے بلکہ موصوف کی شاعری میں تخلیقی جوش کی وجہ سے خیال سے یکے بعد دیگرے حرکت میں آتے ہیں اور انفرادی صورت پذیری کے ساتھ ہی اپنے عہد کے منظر ناموں کو خلق کر کے معانی کے طلسمی جہان آباد کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود ہی لطف الرحمٰن صاحب کہتے ہیں۔

حرف کو ہم نے حکایت کا ہنر بخشا ہے
ہم پیغمبر تو نہ تھے پھر بھی مثالوں میں رہے

❑❑❑

Sabiha Shamim
C/o. Md. Zahid Zubairy
Patna Engineering, National Market Below
SBI Bank, Jain Mandir
Tatarpur, Bhagalpur-812002 (Bihar)

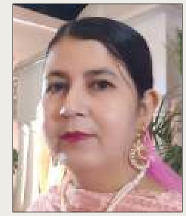

شبانہ عشرت

قاسم خورشید

قلم و ادب کے خورشید تاباں

فن پہ لکھنے کے لیے فنکار کے ظاہر و باطن کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔لوگوں کا نظریہ اِس سے مختلف ہو، مگر ہر انسان کا تجربہ اور مشاہدہ الگ الگ ہوتا ہے۔قاسم خورشید کی زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

زمین کی سطح سے خود کو بلند کر کے آسمان ادب کا درخشندہ ستارہ بننا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اِس کے پیچھے کی جدو جہد کی داستان مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔اِس لیے میں نے عہد کیا کہ اس جہد مسلسل کی داستان کو میں آپ کے روبرو پیش کروں۔شاید ہمارے وہ نوجوان جو مایوسی کا شکار ہیں ان میں ایک عزم اور حوصلہ پیدا ہو۔چار سال کی مختصر سی عمر اور اچانک والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا نا قابل تلافی نقصان تھا۔اس پہ ستم یہ کہ دو چھوٹے بھائی بالترتیب ڈھائی سال اور چھ ماہ کے تھے۔ماں کا عین عالم شباب میں بیوہ ہو جانا کسی المیے سے کم تو نہ تھا۔ماں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔بچوں کے مستقبل کے لیے جینے لگیں۔چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ان کی امی اپنے میکے چلی آئیں۔اس طرح سات سال کی عمر میں وہ اپنے خالہ زاد یعنی مظفر الجاوید صاحب کے یہاں پٹنہ آ گئے۔

یہیں سے قاسم خورشید کی جدو جہد کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ پڑھائی جاری رکھنے کے لیے اسکول میں رہ کر ہی انھوں نے ٹیوشن شروع کیا۔جب کبھی ہاف پینٹ ہی پہن کر ٹیوشن پڑھانے چلے جاتے تو پڑھنے والی ہم عمر بچیاں ہنسنے لگتیں۔رام موہن رائے سیمینری اسکول کی تعلیم کے دوران گورنمنٹ اردو لائبریری کے حسن احمد نے کتابوں سے بڑی مدد کی۔کبھی کبھی لائبریری بند ہونے کے وقت بھی پڑھنے کی سہولت فراہم کرا دیتے۔ان کا یہ کرم ایم۔اے کرنے تک قائم رہا۔

اس دوران ’’پرل موٹرس‘‘ میں انھوں نے کام کیا، پھر بس کے اسٹیل والے پارٹ پرزے پر پالش وغیرہ کا بھی کام کیا۔رزلٹ ہمیشہ اچھا رہا۔جدوجہد کے بعد جب آل انڈیا ریڈیو میں عارضی اناؤنسر ہوئے، یہاں سے قاسم خورشید کی زندگی میں خوشگوار موسم در آیا۔اس سفر میں جہاں ان کی ماں کی مثالی قربانیاں ہیں، وہیں مظفر الجاوید کی سرپرستی نے ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا۔

قاسم خورشید کی پہلی کہانی ’’روک دو‘‘ 1982 میں ’’زبان و

ادب‘‘ پٹنہ میں شائع ہوئی۔ اب تک ان کے 70 سے زیادہ افسانے ملک اور بیرون ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ادب کے علاوہ میڈیا سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ انھوں نے فلموں کے لیے بھی کام کیا۔ پہلی فلم ’’پیڑ ہمارے ساتھی‘‘ بنائی جو دلی دور درشن سے ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ اس کے بعد برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب تک تقریباً ڈیڑھ ہزار فلموں کے لیے کام کر چکے ہیں، پانچ سو سے زائد فلمیں خود ہی تیار کیں جن کی شناخت قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہوئی۔ جاپان فیسٹول تک میں فلم ’’آشا‘‘ دکھائی گئی۔ دور درشن کے قومی اور بین الاقوامی چینلوں کے لیے بھی سینکڑوں پروگرام پیش کیے جن میں ’’آئینہ‘‘ اور ’’بات نکلے گی تو‘‘ خاصے مشہور ہیں۔ ساتھ ہی متعدد اعزاز و اکرام سے بھی انھیں نوازا گیا۔ مشہور فلموں میں ’’نیا سویرا‘‘، ’’آشا‘‘، ’’مندر پربت‘‘، ’’راجگیر‘‘، ’’وقت‘‘، ’’ہمارا جھنڈا‘‘، ’’بول انمول‘‘، ’’بہار و بھوتی‘‘ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

قاسم خورشید کی اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ’’پوسٹر‘‘ (اردو کہانیاں) ’’تھکن بولتی ہے‘‘ (ہندی شاعری) ’’دل تو ہے بنجارا‘‘ (شعری مجموعہ) ’’قانون ساز کاؤنسل میں اقلیت‘‘ (سیاسی تجزیہ) ’’متن سے مکالمہ‘‘ (تخلیقی تنقید) ’’ریت پر ٹھہری ہوئی شام‘‘ (کہانیاں) ’’کینوس پر چہرے‘‘ (کہانیاں) ’’ڈر سے آگے‘‘ (ہندی کہانی) ’’کوئی ہاتھ‘‘ (صدارتی انعام یافتہ ہندی کہانی) ’’گنجا کی نینی‘‘ (ہندی کہانی) ’’کشن پور کی مسجد‘‘ (ہندی کہانی) "Waves" (انگریزی میں کہانیاں) وغیرہ۔ اس کے علاوہ تالیف کی ہوئی کتابیں ’’سنولائی دھوپ‘‘ (کیف کی غزلیں) ’’ٹوٹے ہوئے چہرے‘‘ (طنز و مزاح) ’’درد گزرا ہے دبے پاؤں‘‘ (ٹیلی ڈرامے) ’’چوہے‘‘ (اسٹیج ڈرامے) ’’گئودان تنقید‘‘ (ڈاکٹریٹ کا مقالہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا رجحان تھا۔ سب سے پہلے ہندی کے مشہور رسالے ’’پرگتی شیل سماج‘‘ میں دو غزلیں شائع ہوئیں، پھر دیگر تخلیقی اصناف میں طبع آزمائی کی، پھر ملک اور بیرون ملک کے مختلف رسائل میں لگاتار کہانیاں شائع ہوئیں۔ ساتھ ہی ڈرامے بھی اسٹیج کیے۔ پہلی بار بہار میں اردو اسٹیج کو پریم چند کی کہانی ’’جیل‘‘ کے توسط سے متعارف کرایا، پھر یہ سلسلہ بھی طویل ہوا۔

اپٹا (IPTA) اور دیگر تنظیموں کے ذریعہ بہار اور ملک کے دوسرے گوشے میں بھی ڈرامے اسٹیج کیے۔ ’’ایک اور ہندوستان‘‘، ’’چوہے‘‘، ’’بچوں کی عدالت‘‘، ’’عیدگاہ‘‘، ’’جیل‘‘، ’’مشین‘‘، ’’انگولا کی آواز‘‘، ’’کہرا‘‘ جیسے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ محمد حسن، انتظار حسین، احمد فراز، وہاب اشرفی، رتن سنگھ، قمر رئیس، شہریار، ندا فاضلی، انور سدید، زاہدہ حنا، فاطمہ حسن، جابر حسین، احمد یوسف اور دوسرے مشاہیر ادب نے خصوصی طور پر انھیں اہم ترین افسانہ نگار تصور کیا۔ محمد حسن نے اپنے رسالہ ’’عصری ادب‘‘ میں ان کے افسانے پر اداریہ تک قلمبند کیا ہے۔ وہاب اشرفی نے کئی بار قاسم خورشید صاحب کی تخلیقیت کا ذکر کیا ہے۔ خصوصی طور پر ’’تاریخ ادب اردو‘‘ اور ’’قصہ بے سمت زندگی کا‘‘ میں انھوں نے بہت صراحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔

’’تھکن بولتی ہے‘‘ عنوان کے تحت ہندی میں ایک شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آیا جو کافی مقبول ہوا ہے۔ قومی یا بین الاقوامی مشاعرے میں انھوں نے اپنی شاعری اور مخصوص انداز بیان سے ادبی برادری کو اپنا گرویدہ بنانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ڈرامے کے توسط سے میڈیا کو سمجھنے کا موقع ملا۔ آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر بننے کے لیے آڈیشن دیا۔ اوّل آئے، بہترین آواز اور پیش کش نے مقبولیت عطا کی۔ ریڈیو میں عارضی طور پر رہنے کے باوجود ڈبنگ، ایڈیٹنگ اور ریکارڈنگ بھی لگاتار کی، کئی فیچر لکھے۔‘‘

بہار میں ادیبوں اور شاعروں کو وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوتی جس کے وہ حق دار ہیں۔ خیر وقت سب کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ شاید آنے والے وقت میں انھیں وہ مقام مل جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ انھیں انور سدید نے افسانہ ''کنی کا راجکمار'' کے حوالے سے عہد نو کا منفرد افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر احمد فراز نے کہا تھا کہ قاسم خورشید! تمہاری شاعری میں ایک واضح تصور ہے۔ بھرپور تخلیقیت ہے اور شاید تمہارے افسانوں کا نقطۂ عروج بھی تمہارے اشعار میں جا بجا موجود ہے۔

''تھکن بولتی ہے'' عنوان کے تحت ہندی میں ایک شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آیا جو کافی مقبول ہوا ہے۔ قومی یا بین الاقوامی مشاعرے میں انھوں نے اپنی شاعری اور مخصوص انداز بیان سے ادبی برادری کو اپنا گرویدہ بنانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ڈرامے کے توسط سے میڈیا کو سمجھنے کا موقع ملا۔ آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر بننے کے لیے آڈیشن دیا۔ اوّل آئے، بہترین آواز اور پیش کش نے مقبولیت عطا کی۔ ریڈیو میں عارضی طور پر رہنے کے باوجود ڈبنگ، ایڈیٹنگ اور ریکارڈنگ بھی لگاتار کی، کئی فیچر لکھے۔

قاسم خورشید نے یوں تو زندگی کے ہر موڑ پر خود پتھر تراشتے ہوئے راستہ بنایا، مگر یہاں اُن کے ایک تاریخی کارنامے کا ذکر بھی کرنا چاہوں گی۔ وہ یہ کہ ہندوستان گیر سطح پر بہار سرکار محکمہ تعلیم کے کلاس ون آفیسر کے واحد عہدے کے لیے پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ پوسٹ ایڈورٹائز ہوا جس میں ہندوستان بھر کے سینکڑوں امیدواروں نے انٹرویو دیا اور اس عہدے پر بہت پروقار ڈھنگ سے قاسم خورشید کا انتخاب عمل میں آیا اور قاسم خورشید کو نو زبانوں کے ہیڈ کی ذمہ داری دی گئی جسے انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ بہار میں یوم تعلیم، یوم بہار، گاندھی صدی، شراب بندی، کم عمری کی شادی اور ایسے ہی دوسرے مواقع کے لیے انھیں لگاتار پروگرام کا ڈینیٹر بھی بنایا گیا جس کے تحت بہار میں کئی تاریخی پروگرام ہوئے۔ اب بھی خصوصی طور پر شراب بندی سے متعلق ان کے متعدد سلوگن اور نکڑ ناٹک کے ذریعہ لوگوں کو متحرک کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

''یہ محنت کش'' جیسے مقبول پروگرام کی شروعات کی۔ ان کا ایک بہترین افسانہ ہے ''وھیل چیئر پر سوئی ہوئی لڑکی''

قاسم خورشید نہ صرف ایک معتبر تخلیق کار اور ناقد کے طور پر جانے جاتے ہیں بلکہ وہ ایک بہترین انسان کے روپ میں بھی عوام و خواص کے دلوں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ قاسم خورشید ایک خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ وہ جس سے ملتے ہیں، ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ رسم دنیا نبھانا اور رشتوں کی پاسداری ان کا مشرب ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

یہ رسم دنیا ہے اور ہم نبھاتے رہتے ہیں
تمہارے بعد بھی محفل سجاتے رہتے ہیں

نیا زمانہ نئے لوگ اور نیا ہے فریب
پرانے لوگ تو رشتے نبھاتے رہتے ہیں

محبت میرا مشرب ، میرا مذہب
دلوں میں زہر میں بوتا نہیں ہوں

قاسم خورشید ادب کو عام لوگوں سے مربوط کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ بات چاہے ان کی شاعری کی ہو یا تنقید کی، ان کے یہاں ہم عصر شعرا اور ناقدین کی طرح ژولیدہ بیانی نہیں ملتی۔ وہ مانوس الفاظ کی مدد سے گہری اور فکر انگیز باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم و نثر ہر میدان میں ان کی تحریریں عوام و خواص سبھی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں

یہ محبت ہے جان کی خوشبو
دل میں تیرے امان کی خوشبو

صبح ہوتے ہی ان پرندوں سے
مل رہی ہے اذان کی خوشبو

خود کو پڑھتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں
دل کا عالم کتاب جیسا ہے

یہاں ٹوٹا ہوا پتا ہوا کے ساتھ چلتا ہے
کوئی تنہا نہیں ہوتا خدا کے ساتھ چلتا ہے

قاسم خورشید اس عہد کے وہ فنکار ہیں جنھوں نے اپنے فن سے عالمی سطح پر اعتبار حاصل کیا ہے۔ وہ عزم و استقلال کا استعارہ ہیں۔ انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ بات چاہے ادب کی ہو، صحافت کی یا ٹیلی ویژن اور فلم کی، قاسم خورشید نے خورشید تاباں کی طرح ہر شعبے میں ایسی کرنیں بکھیر دی ہیں کہ آج کی نسلیں بھی ان سے اُجالا لے رہی ہیں اور آنے والی نسلیں بھی ان سے روشنی لے کر ادب کی دنیا کی تاریکیوں کو مٹانے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں گی۔قاسم خورشید کا خوبصورت ادبی سفر ابھی جاری ہے اور اردو کی ادبی دنیا منتظر ہے ، ان کی کسی نئی کاوش کی۔

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

قاسم خورشید اس عہد کے وہ فنکار ہیں جنھوں نے اپنے فن سے عالمی سطح پر اعتبار حاصل کیا ہے۔ وہ عزم و استقلال کا استعارہ ہیں۔انھوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ بات چاہے ادب کی ہو،صحافت کی یا ٹیلی ویژن اور فلم کی، قاسم خورشید نے خورشید تاباں کی طرح ہر شعبے میں ایسی کرنیں بکھیر دی ہیں کہ آج کی نسلیں بھی ان سے اُجالا لے رہی ہیں اور آنے والی نسلیں بھی ان سے روشنی لے کر ادب کی دنیا کی تاریکیوں کو مٹانے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں گی۔قاسم خورشید کا خوبصورت ادبی سفر ابھی جاری ہے اور اردو کی ادبی دنیا منتظر ہے،ان کی کسی نئی کاوش کی۔

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

بہار میں رہ کر قاسم خورشید نے ادب ثقافت اور تعلیم کے شعبے میں بے پناہ محنت کر کے ساری دنیا میں اپنی پہچان بنائی ایک بار اردو کے عالمی شہرت یافتہ لیجنڈ فکشن نگار انتظار حسین کو پریم چند فیلو شپ ملی تو ہندوستان آئے اور پٹنہ آنے کا بھی پروگرام رکھا اور یہاں وہ خصوصی طور پر قاسم خورشید سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ دونوں کی دو دنوں تک پٹنہ کے موریا ہوٹل میں ملاقات ہوئی اور پریم چند کے علاوہ دوسرے ادبی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو اس زمانے میں روزنامہ ''سہارا'' اور بعد میں قاسم خورشید کی تخلیقی تنقید پر مبنی کتاب ''متن اور مکالمہ'' میں بھی شائع ہوئی۔اس طرح بحیثیت شاعر اور بہترین نقابت کے لیے بھی اُن کی پہچان رہی ہے۔اس لیے احمد فراز ، ندا فاضلی ، شہر یار، بشیر بدر، بیکل اتساہی، مخمور سعیدی، راحت اندوری وغیرہ کے ساتھ کئی بین الاقوامی مشاعرے پڑھے نقابت کے فرائض بھی انجام دیے اور تمام شاعروں نے ان کی بے حد پذیرائی بھی کی۔ قابل ذکر ہے کہ جہاں وہ اعلیٰ درجے کے تخلیق کار ہیں وہیں قدرت نے انھیں مسحور کرنے والی آواز بھی عطا کی ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کے بعد ان سے بہتر اور معیاری نقیب بھی کوئی نہیں ہے جو لوگ سن چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی موضوع پر انتہائی پراثر تقریر کے لیے بھی قاسم خورشید ناگزیر تصور کیے جاتے ہیں۔ بہار میں یوم بہار اور یوم تعلیم کے موقعے پر لگاتار کامیاب ترین آل انڈیا مشاعرے اور سیمینار بھی کیے اور دوردرشن کے ادبی پروگرام ''آئینہ'' کے محرک رہے اور سینکڑوں کامیاب ترین اپی سوڈ ٹیلی کاسٹ ہوئے۔

□□□

Shabana Ishrat
C/o Md. Faizan Ahmad
Near Sona Medical
Dargah Road
Pathar Ki Masjid
Patna - 800006 (Bihar)

رابعہ ناز

تانیثیت کا ایک پہلو
عالمی یومِ خواتین

سال 1909 میں نیویارک میں ایک تاریخی تحریک کی بنیاد پڑی جب کپڑے کی ملوں کام کرنے والی ہزاروں خواتین مزدوروں نے اپنی تنخواہوں میں اضافے، کام کے اوقات میں کمی، اور بہتر کام کے حالات کے مطالبے کے لیے سڑکوں پر احتجاج کیا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان خواتین مہاجر تھیں، جو Sweatshops میں بدترین حالات میں کام کرنے پر مجبور تھیں، جہاں انھیں کم اجرت پر طویل وقت تک سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔

یہ ہڑتال ''The Uprising of the 20,000'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ امریکہ کی تاریخ میں خواتین مزدوروں کی سب سے بڑا ہڑتال تھا۔ اس تحریک کی قیادت Clara Lemlich نامی ایک محنت کش رہنما نے کی۔ ان خواتین نے فیکٹری مالکان، پولیس کی زیادتیوں، اور سماجی دباؤ کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ان کے احتجاج کو روکنے کے لیے انھیں گرفتار کیا گیا، تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اور ملازمتوں سے نکالنے کی دھمکیاں دی گئیں، مگر وہ اپنے مطالبات پر ثابت قدم رہیں۔

ان کی اس مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں بہتر لیبر قوانین، مزدور یونینز کی پہچان، اور کام کی جگہوں پر حفاظتی اقدامات کو یقینی بنایا گیا۔ یہ تحریک خواتین کے عالمی دن کے قیام کا بھی ایک بڑا سبب بنی۔ نومبر 1909 سے شروع ہونے والی اس تحریک کی حوصلہ افزائی ،فروری 1909 میں نیویارک میں پہلے عالمی یوم خواتین کی شکل میں امریکی سوسلسٹ پارٹی نے کی۔ پہلا باضابطہ عالمی یوم خواتین 19 مارچ 1911 کو آسٹریا، ڈنمارک، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں منایا گیا، جو 1910 میں کوپن ہیگن میں منعقدہ انٹرنیشنل سوشلسٹ ویمنز کانگریس میں Clara Zetkin کی پیش کردہ تجویز کے بعد عمل میں آیا۔ 1913 میں اس کی تاریخ 8 مارچ کردی گئی، اور تب سے 8 مارچ کو عالمی سطح پر عالمی یوم خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔ United Nations نے 1975 میں باضابطہ طور پر 8 مارچ کو عالمی یوم خواتین کے طور پر تسلیم کرلیا۔

ابتدا میں عالمی یوم خواتین کا مقصد خواتین کی مساوی حیثیت کو تسلیم کروانا تھا، تاکہ انھیں مردوں کے برابر سیاسی، سماجی، قانونی اور معاشی حقوق دیے جائیں۔ یہ دن خواتین کے حق رائے دہی، کام کی جگہ پر برابری، اور صنفی امتیاز کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن کا مقصد محض خوشی منانا، تحفے دینا، خواتین کو خوش رکھنا یا تعریف کرنا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک سماجی اور سیاسی تحریک کا حصہ تھا جس کا مقصد خواتین کے ساتھ روا رکھے گئے استحصال اور نابرابری کو ختم کرنا تھا۔

وقت کے ساتھ عالمی یوم خواتین کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں آ گیا۔ جو دن کبھی ایک انقلابی جدوجہد کی علامت تھا، اب وہ بڑی حد تک برانڈنگ، اشتہارات اور کاروباری حکمت عملی میں بدل گیا ہے۔ آج کی کارپوریٹ دنیا اس دن کو منافع کمانے کے ایک موقعے کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ مختلف برانڈز اس دن کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور سوشل میڈیا پر خواتین کی ''قدرتی خوبصورتی'' یا ''قوت'' کو سراہا جاتا ہے، مگر عملی طور پر خواتین کو حقیقی برابری فراہم کرنے کے اقدامات کم ہی نظر آتے ہیں۔ بڑے ادارے خواتین کے حقوق کے حق میں اشتہارات تو چلاتے ہیں، مگر اپنی کمپنیوں میں خواتین ملازمین کو برابر مواقع نہیں دیتے۔

"عالمی یوم خواتین کا تقاضا ہے کہ ہم خواتین کے لیے برابر مواقع، مساوی اجرت، اور مکمل حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ دنیا کے کئی حصوں میں آج بھی خواتین کو جابرانہ قوانین، غیر مساوی رویوں، اور پدرشاہی نظام کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ محض پھولوں کے گلدستے، تحائف یا سوشل میڈیا پر ہیش ٹیگ چلانے سے خواتین کے حقوق محفوظ نہیں ہوں گے۔ اصل کام یہ ہے کہ مساوی مواقع، اور خواتین کے لیے ایک محفوظ اور باعزت ماحول کی تشکیل کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔

عالمی یوم خواتین کا تقاضا ہے کہ ہم خواتین کے لیے برابر مواقع، مساوی اجرت، اور مکمل حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ دنیا کے کئی حصوں میں آج بھی خواتین کو جابرانہ قوانین، غیر مساوی رویوں، اور پدرشاہی نظام کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ محض پھولوں کے گلدستے، تحائف یا سوشل میڈیا پر ہیش ٹیگ چلانے سے خواتین کے حقوق محفوظ نہیں ہوں گے۔ اصل کام یہ ہے کہ مساوی مواقع، اور خواتین کے لیے ایک محفوظ اور باعزت ماحول کی تشکیل کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔

سیاسی شمولیت اور مساوات کے اس سفر میں، خواتین کے انتخابی حقوق کے حوالے سے مختلف اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، جن میں ''حق رائے دہی (suffrage)''، ''انتخابی حقوق (franchise)'' اور ''ووٹ دینے کا حق (right to vote)'' شامل ہیں۔ بظاہر یہ مترادف الفاظ لگتے ہیں، لیکن ان کے درمیان باریک فرق موجود ہے۔ حق رائے دہی، خاص طور پر ان تحریکوں سے جڑا ہے جو مختلف ممالک میں خواتین کو ووٹ دینے کے حق کے لیے چلائی گئیں۔ انتخابی حقوق ایک وسیع اصطلاح ہے جو کسی بھی فرد یا گروہ کے ووٹ دینے اور سیاسی عمل میں شریک ہونے کے قانونی دائرے کو بیان کرتا ہے، جبکہ ووٹ دینے کا حق کسی ملک کے قوانین کے تحت شہریوں کو دیے جانے والے انفرادی اختیار کی نشاندہی کرتا ہے۔

ابتدائی جدوجہد میں خواتین کی حق رائے دہی ہر جگہ یکساں طور پر نہیں دی گئی بلکہ اسے حاصل کرنے کے لیے مختلف ممالک میں صدیوں کی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی۔ خواتین کو ووٹ دینے کا حق حاصل کرنا جنس کی برابری، شہری حقوق، اور سماجی انصاف کے وسیع تر موضوعات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

نیوزی لینڈ نے 1893 میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق دے کر دنیا کا پہلا خودمختار ملک ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ آسٹریلیا نے 1902 میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق دیا، تاہم مقامی خواتین کے لیے یہ حق محدود تھا۔ فن لینڈ نے 1906 میں یورپ کے پہلے ملک کے طور پر خواتین کو ووٹ دینے اور انتخابی عمل میں حصہ لینے کا حق دیا۔ برطانیہ نے 1918 میں 30 سال یا اس سے زیادہ عمر کی خواتین کو حق رائے دہی دیا، جبکہ امریکہ نے 1920 میں آئینی ترمیم کے ذریعے یہ حق تسلیم کیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد دنیا کے کئی دوسرے ممالک نے خواتین کو ووٹ دینے کا حق دیا۔ بھارت نے آزادی کے بعد تمام بالغ شہریوں کو حق رائے دہی دیا۔ مشرق وسطیٰ میں حکومت کا نظام مختلف ہونے کی وجہ سے سفرج بھی مختلف ہے۔ وہاں خواتین کا

اسٹرگل بھی ترقی یافتہ ممالک سے جدا ہے۔مشرق وسطیٰ میں بادشاہت اور آمریت کے باعث جمہوریت محدود ہے، جس کی وجہ سے مرد و خواتین دونوں کے حقوق بھی محدود ہوتے ہیں۔ وہاں ریاست شہریوں کی مکمل ذمہ داری لیتی ہے، اسی لیے حقوق اور جدوجہد کا تصور مختلف ہے۔

ریاست کی طرف سے خواتین کو صحت، تعلیم (بیرونِ ملک اسکالرشپس سمیت) اور رہائشی سہولتیں حاصل ہیں۔ حکومت فلاحی اقدامات کے ذریعے انھیں معاشی مسائل سے محفوظ رکھتی ہے، جہاں بھاری ٹیکسوں یا تعلیمی قرضوں کا بوجھ نہیں ہوتا۔غور کرنے والی بات یہ ہے کہ امریکہ جیسے جدید اور ترقی یافتہ ملک میں مکمل سفر کے بعد بھی خواتین معاشی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔معاشی خودمختاری، تانیثیت اور عورت کی بااختیاری کا اہم موضوع ہے۔اس لیے دوٹوک جملے میں اس بات کو ختم نہیں کیا سکتا کہ مشرق وسطیٰ میں صرف ووٹ کے حق کی کمی ہی خواتین کی آزادی کی واحد رکاوٹ ہے یا وہاں مکمل پابندیاں ہیں۔

خواتین کی سیاسی نمائندگی ابھی بھی محدود ہے۔ثقافتی اور سماجی رکاوٹیں، جیسے پدری نظام اور صنفی تعصّبات، خواتین کی شمولیت کو متاثر کرتی ہیں۔قانونی اور ادارہ جاتی رکاوٹیں بھی ان کے انتخابی عمل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔عالمی یوم خواتین 2025 ہمیں خواتین کی حق رائے دہی میں ہونے والی ترقی کا جائزہ لینے اور مزید چیلنجز پر غور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔اس سال کی توجہ سیاسی نمائندگی میں اضافہ، صنفی بنیادوں پر تشدد کے خاتمے، اور سیاسی شعور میں اضافے پر ہے۔

عالمی یوم خواتین کے خاص مقاصد میں سے ایک خواتین کے قانونی حقوق کے حوالے سے وقوع پذیر ترقیاتی کاموں اور موجودہ چیلنجز کا جائزہ لینا ہے۔گزشتہ صدی میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے بہت سی قانونی اصلاحات کی گئی ہیں، جن میں خواتین کو صنفی امتیاز، تشدد اور اقتصادی عدم مساوات سے بچانے والے قوانین شامل ہیں۔اس کے باوجود خواتین کے حقوق کی تکمیل کی راہ میں اب بھی کئی رکاوٹیں ہیں۔خاص طور پر ترقی پذیر ممالک اور تنازعات سے متاثر علاقوں میں۔اسی تناظر میں، عالمی سطح پر اور خاص طور پر بھارت میں موجود قانونی فریم ورک خواتین کے حقوق کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

عالمی سطح پر خواتین کے قانونی حقوق میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔خواتین کے لیے سب سے اہم قانونی حق ووٹ دینے کا حق رہا ہے، جو گزشتہ صدی میں دنیا بھر کی خواتین نے حاصل کیا۔آج دنیا کے بیشتر ممالک میں خواتین کو ووٹ دینے اور سیاسی عمل میں شرکت کا قانونی حق حاصل ہے۔حالانکہ خواتین کی سیاسی شرکت میں اضافہ ہوا ہے، لیکن بہت سے ممالک میں اب بھی اعلیٰ عہدوں اور پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی ایک چیلنج ہے۔

ملازمت کے میدان میں صنفی مساوات کو فروغ دینے کے لیے کئی ممالک نے قوانین وضع کیے ہیں، جن کے تحت مساوی کام کے لیے مساوی اجرت دینے اور کام کی جگہ پر صنفی امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن (ILO) اور دیگر عالمی ادارے خواتین کو کام کی جگہ پر تحفظ فراہم کرنے کے لیے سیفٹی پیرامیٹرس مرتب کرتے ہیں، تاکہ انھیں استحصال، ہراسانی یا غیر مساوی اجرت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔تاہم، صنفی اجرت میں فرق اب بھی موجود ہے اور خواتین مختلف شعبوں میں قیادت کے عہدوں پر کم نمائندگی رکھتی ہیں۔

تولیدی حقوق (Reproductive Rights) میں قانونی اصلاحات نے خواتین کو اپنے جسم پر زیادہ خودمختاری دی ہے۔کونٹراسپٹوس، فیملی پلانگ اور اسقاط حمل کی خدمات بہت سے ممالک میں قانونی ہیں، اگرچہ ان خدمات کی رسائی اور حدود میں نمایاں فرق ہے۔تولیدی حقوق کے بارے میں بحث ابھی بھی ایک متنازعہ موضوع ہے، اور کچھ ممالک نے خواتین کے تولیدی حقوق کو واپس لے لیا ہے۔

جنس پر مبنی تشدد گھریلو تشدد، جنسی زیادتی اور انسانی اسمگلنگ، ایک پھیلا ہوا مسئلہ ہے۔اس کے خلاف خواتین کو تحفظ دینے کے لیے قوانین بنائے گئے ہیں، جیسے Convention on the Elimination of All Forms of Discriminations against Women(CEDAW) اور ''استنبول کنونشن''، جنھوں نے اہم قانونی precedents قائم کیے ہیں۔بہت سے ممالک

نے خواتین کے خلاف تشدد کو criminal offence قرار دیا ہے اور ان کے تحفظ کے لیے میکنزم فراہم کیے ہیں، حالانکہ ان قوانین کا نفاذ اب بھی پوری طرح نہیں ہوسکا ہے۔

عالمی سطح پر قانونی اصلاحات نے خواتین کو جائیداد وراثت میں حصہ لینے اور زمین کا مالکانہ کا حق دیا ہے، جو تاریخی طور پر بہت سے معاشروں میں ان سے چھین لیا گیا تھا۔ ان اصلاحات کے باوجود، بعض علاقوں میں خواتین کے جائیداد کے حقوق اب بھی محدود ہیں، خاص طور پر ایسے معاشروں میں جہاں پدرشاہی اور روایتی جنس کے کردار غالب ہیں۔

ثقافتی اور مذہبی رکاوٹیں اب بھی عالمی سطح پر خواتین کے حقوق کو درپیش چیلنجز میں اہم ہیں۔ کئی ممالک میں ثقافتی اور مذہبی روایات، خواتین کے قانونی حقوق کو محدود کرتے ہیں۔ Customary Laws اکثر Formal legal protections کو غیر مؤثر بنا دیتے ہیں، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں patriarchy اور صنفی امتیاز غالب ہیں۔

خواتین کے لیے عدلیہ تک رسائی عالمی سطح پر ایک اہم مسئلہ ہے۔ کئی ممالک میں قانونی نظام خواتین کے خلاف امتیاز کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہتے ہیں، اور خاص طور پر دیہی اور غریب علاقوں میں خواتین کو قانونی معلومات، مالی وسائل، اور سماجی حمایت کے فقدان کا سامنا ہوتا ہے، جہاں قوانین موجود ہیں، وہاں ان کے نفاذ میں سیاست شامل ہوجاتی ہے یا یوں کہیں سیاسی عزم کی کمی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ کئی ممالک میں سیاسی اور قانونی نظام خواتین کے حق میں تبدیلی لانے کے خلاف ہیں، یا موجودہ قوانین کو مکمل طور پر نافذ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

بھارت، ایک متنوع اور تیز رفتار ترقی کرنے والا ملک ہے، جس نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے اہم پیش رفت کی ہے، لیکن ان حقوق کی تکمیل اور نفاذ میں مشکلات باقی ہیں۔ ملک کے قانونی فریم ورک میں وقت کے ساتھ ساتھ خواتین کے حقوق کے لیے اصلاحات ہوتی رہی ہیں، لیکن اب بھی بہت سے چیلنجز موجود ہیں جنھیں حل کرنا ضروری ہے تاکہ gender equality کو یقینی بنایا جاسکے، خاص طور پر دیہی علاقوں اور پسماندہ کمیونٹیز میں۔

بھارت میں خواتین کو آئینی حقوق حاصل ہیں، جیسے کہ آئین کے آرٹیکل 14 کے تحت قانون کے سامنے مساوات کی ضمانت اور آرٹیکل 15 کے ذریعے جنس کی بنیاد پر امتیاز کی ممانعت۔ آرٹیکل 23 انسانوں کی اسمگلنگ اور جبراً مزدوری پر پابندی عائد کرتا ہے، جس سے خواتین کو استحصال سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ آرٹیکل 21 کے تحت ہر شہری کو زندگی اور ذاتی آزادی کا حق حاصل ہے، جس میں عزت کے ساتھ جینے کا حق اور کسی بھی قسم کے تشدد سے تحفظ شامل ہے۔ بھارت میں شادی اور خاندان سے متعلق قوانین میں ہندو میرج ایکٹ 1955؛ مسلمان خواتین (طلاق پر حقوق کا تحفظ) ایکٹ 1986؛ اور اسپیشل میرج ایکٹ 1954 شامل ہیں۔ یہ قوانین خواتین کو شادی، طلاق، اور نان و نفقہ میں تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ گھریلو تشدد سے خواتین کا تحفظ ایکٹ 2005، ایک سنگ میل قانون ہے جس کے ذریعے خواتین کو گھریلو تشدد سے تحفظ حاصل ہے، بشمول جسمانی، جذباتی اور اقتصادی بدسلوکی۔ یہ خواتین کو تحفظ کے احکام، رہائشی احکام اور مالی مدد کے لیے درخواست دینے کا حق دیتا ہے۔ بھارت میں جنسی ہراسانی اور حملے کے خلاف (Sexual Harassment and Assault) قوانین میں کرمنل لا (ترمیمی) ایکٹ 2013، اور خواتین کے ساتھ جنسی ہراسانی کے خلاف ایکٹ 2013، شامل ہیں، جن کے تحت جنسی تشدد کے مرتکب افراد کے لیے سخت سزائیں ہیں اور workplaces پر جنسی ہراسانی کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔

میڈیکل ٹرمینیشن آف پریگننسی ایکٹ 1971، اور maternity بینیفٹ (ترمیمی) ایکٹ 2017، نے تولیدی حقوق کے تحفظ کو مضبوطی دی، جبکہ ہندو وراثت (ترمیمی) ایکٹ 2005، نے خواتین کو آباؤاجداد کی وراثت میں مساوی حقوق دیے ہیں۔

تولیدی حقوق کو عالمی سطح پر انسانی حقوق کا لازمی حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان میں خاندانی منصوبہ بندی، مانع حمل تک رسائی، محفوظ اسقاط حمل، اور جامع تولیدی صحت کی خدمات کے حقوق شامل ہیں۔ یہ حقوق خواتین کی خودمختاری، صنفی مساوات، اور مجموعی بہبود کے لیے

اہم ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے مطابق، جنسی اور تولیدی صحت نہ صرف افراد کی صحت پر بلکہ معاشرتی اور اقتصادی ترقی پر بھی براہ راست اثر ڈالتی ہے۔اس کے باوجود، دنیا بھر میں بہت سے چیلنجز موجود ہیں۔غیر محفوظ اسقاطِ حمل ایک اہم مسئلہ ہے، جو ماؤں کی بیماریوں اور اموات کی وجہ بنتا ہے۔ عالمی سطح پر، غیر محفوظ اسقاطِ حمل ہر سال تقریباً 13 فیصد ماؤں کی اموات کا سبب بنتا ہے۔ مزید یہ کہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں جدید مانع حمل کی عدم دستیابی لاکھوں خواتین کو غیر منصوبہ بند حمل اور اس سے وابستہ خطرات کا سامنا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔اس کا سب سے زیادہ اثر محروم طبقوں پر ہوتا ہے، جہاں وسائل اور تعلیم کی کمی مسئلے کو مزید خراب کرتی ہے۔

بھارت نے گزشتہ دہائیوں میں تولیدی حقوق اور خواتین کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے قابل ذکر پیش رفت کی ہے۔ زچگی سے متعلق اموات کی شرح میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے، جو 2004 میں 254 فی 100,00 زندہ پیدائشوں سے کم ہو کر حالیہ برسوں میں 97 فی 100,000 رہ گئی ہے۔حکومت کی مختلف اسکیموں، جیسے جننی سرکشا یوجنا اور نیشنل ہیلتھ مشن نے زچگی کی صحت کی خدمات تک رسائی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی تانیثیت کی علم بردار خواتین کا ماننا ہے کہ 1900 تک خاندانی منصوبہ بندی کسی بھی ریاستی پالیسی کا حصہ نہیں تھی، اس لیے حکومت کو اس بہانے سے خواتین کی نجی زندگی میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم، آج خاندانی منصوبہ بندی کو معاشرتی اور قومی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا جا رہا ہے، اور حکومت اسے مؤثر بنانے کے لیے ہر ممکن حد تک کوشش کر رہی ہے۔

بھارت میں تولیدی حقوق کو قانونی تحفظ حاصل ہے، جس میں میڈیکل ٹرمینیشن آف پریگننسی ایکٹ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ 2022 میں، سپریم کورٹ نے اس ایکٹ کے دائرے کو وسیع کیا، اور تمام خواتین، چاہے ان کی ازدواجی حیثیت کچھ بھی ہو، کو 24 ہفتے تک اسقاطِ حمل کی خدمات حاصل کرنے کا حق دیا۔ یہ پیش رفت عالمی انسانی حقوق کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے اور جسمانی خودمختاری کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

تعلیم لڑکیوں کا بنیادی حق ہے اور یہ صنفی مساوات، غربت کے خاتمے اور پائیدار ترقی کے لیے کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کے متعینہ پائیدار ترقی کے اہداف (United Nations Sustainable Development Goals)، خاص طور پر معیاری تعلیم (SDG 4) اور صنفی مساوات (SDG 5)، کے تحت لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے کی سمت میں عالمی سطح پر اہم پیش رفت ہوئی ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کو درپیش چیلنجز علاقائی اور مختلف ہیں۔ افریقہ، افغانستان، اور دیگر تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں لاکھوں لڑکیاں اسکول جانے سے قاصر ہیں۔ ان مسائل میں بچوں کی شادی، ابتدائی حمل، اور معاشی مشکلات شامل ہیں، جو اکثر لڑکیوں کو تعلیم سے محروم کر دیتے ہیں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں اسکولوں میں بنیادی صفائی کی سہولتوں کی کمی، خاص طور پر الگ بیت الخلا اور conveyance بھی لڑکیوں کے اسکول جانے میں رکاوٹ بنتی ہے، خاص طور پر جب وہ بلوغت تک پہنچتی ہیں۔ ثقافتی رویے، صنفی تعصّبات، اور روایتی طرز فکر بھی ان کے تعلیمی سفر کو محدود کرتے ہیں۔

بھارت میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے اہم کامیابیاں دیکھی گئی ہیں۔ ''بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ'' جیسی مہمات اور حقِ تعلیم ایکٹ (RTE) کے نفاذ نے پرائمری اسکولوں میں صنفی برابری کو حاصل کرنے میں مدد فراہم کی ہیں۔ سرکاری اسکیموں جیسے ''کستورباگاندھی بالیکا ودیالیہ'' اور وظیفہ پروگراموں نے پسماندہ طبقات کی لڑکیوں کو تعلیم میں شامل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیے ہیں۔ ڈیجیٹل تعلیم اور حکومتی منصوبے، جیسے ''پی ایم ای ودیا''، نے دیہی اور دور دراز علاقوں میں لڑکیوں تک تعلیمی وسائل پہنچائے ہیں، خاص طور پر کووڈ-19 کے دوران۔

❑❑❑

Dr.Rabia Naz
C-81,2nd Floor, Ganesh Nagar
Tilak Nagar, New Delhi-110018
rabia.naz3@gmail.com

کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور خواتین

عادل حسین بٹ

کشمیر وہ منفرد خطہ ہے جو جس کی تاریخ کے تحریری ریکارڈوں کا ایک مستقل سلسلہ مسلم حکمرانی کے دور تک بلا تعطل جاری رہا۔ یہ ایک معتبر تاریخی روایت کا درجہ رکھتا ہے۔ راجترنگنی کے مصنف کلہنہ نے اپنے پیشرو کے طور پر کئی مورخین کا ذکر کیا ہے۔ تاہم ان میں سے کسی کا بھی کام آج تک محفوظ نہیں رہ سکا۔ ان تاریخی سلسلوں کو جوناراج، سریوارا، پرجا بھٹیا، اور سوکا نے 1596 تک جاری رکھا۔ اسی دوران، 1320 میں کشمیر میں مسلم سلطنت کے قیام کے بعد، فارس اور ترکستان سے متعدد اہلِ علم وادی کشمیر میں وارد ہوئے، جو اپنے ہمراہ فارسی اور وسطی ایشیائی تاریخ نویسی کی روایات بھی لائے۔ اس طرح کشمیر میں قرون وسطیٰ کے دوران تاریخی متون کی ایک کثیر تعداد تحریر کی گئی۔ کشمیر کا ابتدائی دور سے ہی فارس کے ساتھ رابطہ قائم تھا، اور اپنے بیشتر تاریخی ادوار میں فارس اور کشمیر کے مابین گہرے تعلقات قائم رہے۔ تاہم، یہ مسلم سلطنت کے قیام کے بعد تھا کہ فارسی ثقافت کے مراکز کے ساتھ کشمیریوں کے روابط مزید مستحکم ہو گئے۔ اگرچہ فارسی کشمیر کی سرکاری زبان بن چکی تھی، لیکن سنسکرت کو شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ سنسکرت میں لکھی گئی واحد دستیاب تاریخ سلطان زین العابدین کے دور کی ہے، جبکہ ان کے دورِ حکومت میں کشمیر میں مقامی فارسی تاریخی ادب کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ ان تاریخی دستاویزوں میں متعدد خواتین کا ذکر ہے جو ریاستی امور میں بھرپور حصہ لیتی رہیں اور بادشاہوں کے عروج و زوال، خوشیوں وغموں اور کامیابیوں و ناکامیوں میں شریک رہیں۔ ان تاریخوں میں خواتین کے بڑے یا چھوٹے کردار کو مختلف زاویوں سے دستاویزی شکل دی گئی ہے، جن میں بعض نے انتظامی فرائض سرانجام دیے، بعض نے معاشرتی اصلاح میں حصہ لیا، اور بعض نے تعمیراتی سرگرمیوں کے ذریعے اپنے اثرات چھوڑے۔ قدیم اور قرون وسطیٰ کے کشمیر میں خواتین کی فعال شرکت نے اس وقت کے تاریخ دانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ خواتین کے سیاسی، سماجی، اور ثقافتی کردار نے تاریخ کے مختلف بیانیوں میں اپنی جگہ بنائی۔

متن کے مؤلف، ''ویٹاستا کی بیٹی''، اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خواتین، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری، عوامی زندگی میں سرگرم تھیں اور اس دور کے معاشرتی ڈھانچے پر ان کا گہرا اثر و رسوخ تھا، یہاں تک کہ ریاستی امور میں بھی ان کی آواز نمایاں تھی۔ مسیحی عہد کے آغاز کے قریب سامریت کے دور میں، ویدک علم بڑی حد تک وسیع تر ہندوستانی سماجی ڈھانچے میں خواتین کے لیے ناقابل رسائی تھا۔

تاہم، کچھ غیر روایتی فرقوں نے انھیں اپنے دائرے میں شامل رکھنا جاری رکھا۔ یہ قدامت پسندانہ رجحان شمالی ہندوستان میں عام تھا، لیکن کشمیر، اپنے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں اور جغرافیائی دوری کے باعث، اس غالب ذہنیت سے محفوظ نظر آتا ہے۔ کشمیر کے ہندو دور میں اس کی سیاسی تاریخ کا ایک قابل ذکر پہلو ریاستی امور میں خواتین کی اہم اور بعض اوقات کلیدی شرکت تھی۔ چاہے وہ ملکہ ہوں، شاہی حرم کے عام ارکان، یا درباری، خواتین اکثر سیاسی منظرنامے کا حصہ بنیں۔ قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے کشمیر میں خواتین مختلف شعبہ ہائے زندگی میں فعال طور پر حصہ لیتی تھیں، یہ بات اس حقیقت کی عکاسی ہے کہ خواتین متحرک اور مؤثر تھیں۔

کشمیری ثقافت میں خواتین کی فعالیت کی ایک طویل اور نمایاں روایت رہی ہے۔ انھیں مختلف سماجی شعبوں میں فعال مصروفیت کے بے شمار مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ درحقیقت،''وہ سیاسی میدان میں نمایاں ہوئیں، اپنی جائیدادوں کا انتظام سنبھالا، اور حتیٰ کہ جنگ کے میدان میں جرنیلوں اور کمانڈروں کے طور پر قیادت کی۔ ایک روایت، جو قانونی حیثیت کی حامل تھی، یہ حکم دیتی تھی کہ بادشاہ کی تاجپوشی کی تقریب میں ملکہ کی لازمی موجودگی اور فعال شرکت ضروری ہے۔ ملکہ نے اہم مواقع پر شاہی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ لیا، اپنی علیحدہ مشاورتی ٹیم اور وسائل حاصل کیے، اور کم عمر شہزادوں کے لیے نگران یا خودمختار حکمران کے طور پر اختیارات حاصل کیے۔ بادشاہ شاذ و نادر ہی کسی اہم مسئلے پر ملکہ سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ کرتا، اور اہم عہدوں پر تقرریاں بھی ملکہ کے مشورے کے بغیر نہیں کی جاتی تھیں۔ ڈاٹر آف وِتاستا'' کے مصنف کے مطابق، ابتدائی ادوار سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک کشمیری خواتین نے قابل ذکر خودمختاری اور اختیارات حاصل کیے، جو انھیں معاشرے میں ایک بلند مقام فراہم کرتے تھے۔ بدھ مت کے اثرات کے تحت، اس خطے کی خواتین نے بڑھتی ہوئی آزادی اور فکری ترقی کے مواقع کا تجربہ کیا۔ تریکا فلسفے کے تانترک فرقے کے اندر، خواتین دیوتاؤں کی پوجا اور خواتین سنتوں کا قیام نمایاں حیثیت اختیار کر گیا۔ تریکا روایت کے ایک معروف عالم ابھینو اگپتا نے خواتین کے لیے فلسفیانہ مطالعہ میں مردوں کے ساتھ برابری کے حقوق پر زور دیا اور انھیں مذہبی رسومات اور تقاریب میں شریک ہونے کا حق دیا۔ کشمیری خواتین کی خوبصورتی اور ان کی علمی و فکری فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے، شاعر بلہانہ اپنی "وکرمانکا دیو کریتا" میں بیان کرتی ہیں کہ وہ سنسکرت زبان میں روانی سے گفتگو کرتی تھیں۔ کلہن اور دیگر مصنفین نے بھی مختصراً ان کی علمی قابلیت اور فطانت کا ذکر کیا ہے۔

"قدیم کشمیر کی صنفی حرکیات کو سمجھنے کے لیے اس کی ابتدائی روایات اور تاریخی حوالہ جات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ "تاریخِ حیدر ملک" کے مصنف نے کشمیر کی ابتدا سے متعلق متعدد روایات پر روشنی ڈالی ہے، جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کشمیر کبھی ایک جھیل تھی، جسے "ستیسر" کہا جاتا تھا اور جس کا نام دیوی پاروتی کے نام پر رکھا گیا تھا، جو کہ مہادیو (شیو) کی بیوی تھیں۔ پاروتی، ہندو افسانوں میں نسائیت، زرخیزی، اور پرورش کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ کشمیر کی زمین سے پاروتی کی وابستگی، خاص طور پر جب یہ ایک جھیل کی صورت میں تھی، خواتین اور قدرتی ماحول کے درمیان ایک گہرے تعلق کی علامت ہو سکتی ہے۔ اس تعلق کو مزید اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ خواتین کس طرح زمین اور اس کے وسائل کی نگرانی کے کردار میں نظر آتی ہیں۔"

قدیم کشمیر کی صنفی حرکیات کو سمجھنے کے لیے اس کی ابتدائی روایات اور تاریخی حوالہ جات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ''تاریخِ حیدر ملک'' کے مصنف نے کشمیر کی ابتدا سے متعلق متعدد روایات پر

روشنی ڈالی ہے، جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کشمیر کبھی ایک جھیل تھی، جسے ''ستیسر'' کہا جاتا تھا اور جس کا نام دیوی پاروتی کے نام پر رکھا گیا تھا، جو کہ مہادیو (شیو) کی بیوی تھیں۔ پاروتی، ہندو افسانوں میں نسائیت، زرخیزی، اور پرورش کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ کشمیر کی زمین سے پاروتی کی وابستگی، خاص طور پر جب یہ ایک جھیل کی صورت میں تھی، خواتین اور قدرتی ماحول کے درمیان ایک گہرے تعلق کی علامت ہوسکتی ہے۔ اس تعلق کو مزید اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ خواتین کس طرح زمین اور اس کے وسائل کی نگرانی کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ دامودرا اول کی وفات کے بعد، حکمرانی اس کی بیوی رانی جشومتی (جسے یشوتی بھی کہا جاتا ہے) کے سپرد کی گئی، جنھوں نے سیاسی مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے کامیابی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اپنے حمل کے دوران، انھوں نے ریاستی امور کو مؤثر طریقے سے سنبھالا، اور ان کی حکومت کا اختتام ان کے بیٹے، بال گونند (گونندا دوم) کی پیدائش پر ہوا۔ اگرچہ ان کا دورِ حکومت مختصر تھا، لیکن وہ ریاست پر عملی طور پر مکمل کا اختیار برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔ اپنے بیٹے کی کم سنی کی طویل مدت کے دوران، انھوں نے ریاست کے امور کو سنبھالنے کے لیے بطور ریجنٹ (نگران حکمران) اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ رانی جشومتی اپنے عمدہ کردار اور اٹل اصولوں کے لیے مشہور تھیں، اور ان کی شخصیت نے سلطنت پر ایک مستحکم اثر چھوڑا۔ ''تاریخِ حیدر ملک'' میں راجہ سندر (سرندرا) کی بیٹی، کتابون، اور ایران کے بہمن اسفندیار کے ساتھ اس کے اتحاد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کتابوں کو غیر معمولی خوبصورتی، دلکشی، اور شاندار کردار کی حامل شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سوداگر کے ہمراہ راجہ سندر کے دربار میں پہنچی، جو قیمتی پتھروں سے بھری ہوئی تجارت کرتا تھا۔ تاہم، ان جواہرات کی قدر کا صحیح اندازہ نہ ہونے کے باعث، راجہ سندر اور اس کے درباریوں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ بعد میں کتابون نے سوداگر کو بلایا اور دل کھول کر اس کے سامان کی قیمت ادا کی۔ جب سوداگر وطن واپس لوٹا، تو اس نے کتابون کی خوبصورتی اور شخصیت کا تذکرہ بہمن اسفندیار کے سامنے کیا، جس کے نتیجے میں بہمن کے دل میں کتابون کے لیے محبت پیدا ہوئی اور اس نے شادی کی تجویز پیش کی۔ یہ تاریخی واقعات اور روایات کشمیر کی قدیم تاریخ میں خواتین کے کردار کی عکاسی کرتے ہیں، جو کہ نہ صرف سیاسی معاملات میں بلکہ سماجی اور ثقافتی زندگی میں بھی اہمیت کے حامل تھے۔

''ملکہ سوگندھا (سوگندھا دیوی) نے نہ صرف فوجی مہمات میں اہم کردار ادا کیا بلکہ شنکا ورمن کے ساتھ سیاسی فیصلوں میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ شنکا ورمن کے انتقال کے بعد، ملکہ نے نابالغ شہزادے کی ریجنٹ کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالیں، جس دوران انھوں نے ریاستی معاملات کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ باغی سرداروں کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے، انھوں نے پربھاکرا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی تاکہ اندرونی بے وفائی کو قابو میں لایا جاسکے۔''

ملکہ سوگندھا (سوگندھا دیوی) نے نہ صرف فوجی مہمات میں اہم کردار ادا کیا بلکہ شنکا ورمن کے ساتھ سیاسی فیصلوں میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ شنکا ورمن کے انتقال کے بعد، ملکہ نے نابالغ شہزادے کی ریجنٹ کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالیں، جس دوران انھوں نے ریاستی معاملات کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ باغی سرداروں کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے، انھوں نے پربھاکرا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی تاکہ اندرونی بے وفائی کو قابو میں لایا جا سکے۔ جب گوپال ورمن اور اس کے بھائی سمکاتا کی موت ہوئی اور کوئی مرد وارث نہ رہا، تو یہ صورت حال جانشینی کے معاملے میں غیر یقینی کی کیفیت پیدا کرگئی۔ عوامی حمایت کی ایک بڑی علامت یہ تھی کہ ایک عوامی اسمبلی کے دوران ملکہ سوگندھا کو متفقہ طور پر تخت کے لیے منتخب کیا گیا۔ تاہم، تانتریوں کے خلاف فوجی جدوجہد میں شکست

کے بعد ملکہ کو قید کر لیا گیا، اور ان کی حکومت صرف دو سال کے مختصر عرصے تک برقرار رہی۔

ملکہ ڈیڈا کی حکمرانی کی کہانی، جو لوہارا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، قدیم کشمیر کی تاریخ میں بڑے پیمانے پر تسلیم کی جاتی ہے۔ ملکہ ڈیڈا کو پہلے ملکہ کے ساتھی، پھر ریجنٹ، اور آخر کار خود مختار حکمران کے طور پر تین دہائیوں سے زیادہ عرصے تک کشمیر پر حکومت کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی حکمرانی کے دوران، انھوں نے بدعنوانی کا قلع قمع کرنے، ریاستی معاملات میں توازن برقرار رکھنے، اور معاشرتی بگاڑ کو روکنے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ اگرچہ ان کی کوششیں کشمیر کے وسیع زوال کو روکنے میں مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکیں، لیکن ڈیڈا کی قیادت کی صلاحیت اور حکمرانی میں مہارت کو وسیع پیمانے پر سراہا گیا۔

ملکہ کوٹا ڈوی (کوٹا رانی) کی کہانی بھی کشمیر کی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔ انھوں نے تقریباً ایک دہائی تک حکومت کی اور غیر ملکی تسلط سے اپنی سرزمین کی آزادی کے دفاع میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے سیاسی معاملات میں خود کو فعال رکھا اور اپنی قیادت کے ذریعے کشمیر کو استحکام بخشنے کی کوشش کی۔ سلطان رنچینا سے شادی کے بعد، ملکہ کوٹا رانی نے سلطنت کے استحکام اور امن کے قیام کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ رنچینا کی موت کے بعد، انھوں نے ادیان دیو کو تخت پر بٹھانے کے عمل میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

کشمیر کی تاریخ میں راجہ جلوک کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے ملک حیدر ریکارڈ کرتے ہیں کہ ان کی اہلیہ یعنی ایشانی رانی (ایشاں دیوی) ایک عظیم انسان دوست تھیں اور انھوں نے گاؤں (موزہ) دراز کی بنیاد رکھی اور اسے غریبوں کے لیے وقف کے طور پر عطیہ کیا۔ اس نے آرٹ، فن تعمیر اور مذہب میں گہری دلچسپی لی۔ وہ کشمیری برہمنوں کے فلسفے سے اچھی طرح واقف تھی اور مذہبی موضوعات پر با آسانی علما کے ساتھ گفتگو کر سکتی تھی۔ انھوں نے مندر بنائے اور شیو دیوی، سپتا ماتریکا کو نصب کیا۔ راجہ بکا کے دور میں ایک درویش خاتون (جوگی) بکوتی کا نام سامنے آیا۔ گاؤں (موزہ) ہاران میں ایک پتھر پر بیٹھ کر انھوں نے کفایت شعاری کی۔ متن کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس پتھر پر ان کے گھٹنوں کا نشان اب بھی نظر آتا ہے۔ راجہ تو جر (تونجینا) اور اس کی پاکباز اور بیوی یعنی واگ پاستا (واکپستا) کے خشک سالی کے بحران سے نمٹنے کے لیے کیے گئے اقدامات سے متعلق ایک بیان اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ بادشاہ کے فیصلے کو عورت کے دانشمندانہ مشورے سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ خود سوزی کی سوچ کو ختم کرنے کے بارے میں اس کا نظریہ، جیسا کہ بادشاہ نے بھوکے لوگوں کی مدد کرنے اور آج رات خدا کے حوالے کرنے میں ناکامی کی وجہ سے فیصلہ کیا۔ بادشاہ راضی ہو گیا اور ساری رات عبادت میں گزاری جس کے نتیجے میں لوگوں کے لیے رزق کا دروازہ کھل گیا۔ اس نے بھاری برفباری کی وجہ سے ہونے والی عام پریشانی کو کم کرنے میں بادشاہ کی مدد کی، جس کے نتیجے میں خوراک کی فراہمی میں کمی واقع ہوئی، خاص طور پر کشمیریوں کے لیے چاول کی اہم خوراک۔

آنگلیکھا کی کہانی اس کے قصور اور جس طرح سے اس نے اپنے بے گناہ شوہر کو برا بھلا کہا، غصہ دلایا اور بدسلوکی کی۔ راجہ رتسین (دکن کے حکمران) کی بیٹی رانی رائنا ایک بہت ہی مہربان اور پرہیزگار خاتون تھی جس کی راجہ زیادت سے شادی ہوئی، کچھ عرصہ حکومت کرنے کے بعد راجہ زیادت اپنی بیوی اور فوج کی رضامندی سے غار بومہزوہ میں چلا گیا۔ مندر سوم کارتک کی رقص کرنے والی لڑکی کملا کی کہانی اس بات کی عکاسی ہے کہ بادشاہ بلیڈیت (بلاچیتہ) نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے اسے اپنا عاشق بنالیا۔ کملا جو اُس سے مگن ہو چکی تھی، رقص کو بالکل چھوڑ کر شدید اور بے قابو محبت کے ساتھ مندر سے باہر نکل آئی۔ اسی طرح یہ کہانی ایک سوداگر کی طرف سے ایک لونڈی کو مہادیو کے مندر میں بھگوان کی عقیدت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد، اسے راجہ پرتاپ (پرتاپادتیہ) کے محل میں لایا گیا اور چار بیٹوں کو جنم دیا۔ تاریخ کشمیر کے مصنف ملک حیدر نے دکن کی فتوحات کو بیان کرتے ہوئے زنتا رانی کے بارے میں بتایا جو ایک بڑی فوج اور دس ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ اس سے لڑنے کے لیے نکلی۔ راجہ چکرورمن نے لولی کو حکومتی معاملات میں مکمل مداخلت کی اجازت دی جس سے وہ محبت کرتا تھا اور اس کے رشتہ داروں کو اعلیٰ مقام دیا۔

منڈن مشرا کی اہلیہ اوبیا بھارتی نے شنکراچاریہ اور مسرا کے درمیان تاریخی بحث کے دوران جج کے طور پر کام کیا جو مذہب پر

مقامی مقتدر تھے۔ سرا اس بحث میں ہار گئے لیکن ان کی ہونہار بیوی نے اسے اٹھالیا اور شنکرا چاریہ کو التوا کی درخواست کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے بحالی کے عمل میں اس وقت حصہ لیا جب درلبھ وردن کے دور حکومت میں بھاری سیلاب نے زمین کی تزئین کو تباہ کر دیا۔ انھوں نے خدمت گذاروں اور علما کو ان کے مذہب کی پرواہ کیے بغیر اپنی سرپرستی فراہم کی۔

"کشمیری تاریخ میں خواتین کا سیاسی اور سماجی کردار مختلف جہتوں کا حامل رہا ہے۔قابل ذکر خواتین جیسے رانی رائنا، کملا، اور سریلیکھا نے بھی اپنی دانشمندی، قیادت، اور سماجی اصلاحات کے ذریعے کشمیر کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ملکہ سوری متی نے بھی بادشاہ اننتا کی شریک حیات کے طور پر ملکی معاملات میں فعال حصہ لیا اور اپنے وقت کے سیاسی حالات میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان تمام مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدیم کشمیر میں خواتین نے نہ صرف سیاسی حکمرانی میں بلکہ سماجی اصلاحات اور مذہبی امور میں بھی اہم کردار ادا کیا۔"

سریلیکھا، سنگراماراجا کی ملکہ کے طور پر باصلاحیت خاتون، نہ صرف ایک باصلاحیت منتظم بلکہ ایک آزاد خیال سماجی مصلح بھی تھیں۔ اس نے ذات پات کے نظام کی مسلط کردہ پابندی کی مخالفت کی اور جب بھی اسے پایا میرٹ کو پہچاننے میں کامیاب رہی۔ بڑی توانائی کے ساتھ، اس نے اپنی مخالفت کو مؤثر طریقے سے دبایا اور یہاں تک کہ اپنے متعصب رئیسوں کو بھی خاموش کرا دیا۔ اس نے راہبوں، سنیاسیوں اور راہباؤں کے فائدے کے لیے خانقاہیں بھی بنائیں۔

کشمیری تاریخ میں خواتین کا سیاسی اور سماجی کردار مختلف جہتوں کا حامل رہا ہے۔قابل ذکر خواتین جیسے رانی رائنا، کملا، اور سریلیکھا نے بھی اپنی دانشمندی، قیادت، اور سماجی اصلاحات کے ذریعے کشمیر کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ ملکہ سوری متی نے بھی بادشاہ اننتا کی شریک حیات کے طور پر ملکی معاملات میں فعال حصہ لیا اور اپنے وقت کے سیاسی حالات میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان تمام مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدیم کشمیر میں خواتین نے نہ صرف سیاسی حکمرانی میں بلکہ سماجی اصلاحات اور مذہبی امور میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

کشمیر کی تاریخ میں خواتین کے تجربات کی جستجو سے قیادت، استقامت، اور اثر و رسوخ کی بھرپور کہانی سامنے آتی ہے۔ تاریخی تواریخ کے ذریعے، ہم مختلف شعبہ ہائے زندگی میں خواتین کی نمایاں شراکت کا مشاہدہ کرتے ہیں، جن میں حکمرانی، سفارت کاری، مذہبی سرپرستی، اور سماجی اصلاحات شامل ہیں۔ صنفی تعصّبات اور معاشرتی پابندیوں کے باوجود، کشمیر میں خواتین نے اہم اختیارات حاصل کیے، سیاسی نتائج پر اثر انداز ہوئیں، اور پائیدار میراث چھوڑی۔ رانی جشومتی، کوٹا رانی، اور ڈیڈا جیسی شخصیات پیچیدہ سماجی و سیاسی منظرنامے میں خواتین لیڈروں کے ناقابل تسخیر جذبے اور تزویراتی ذہانت کی مثالیں ہیں۔ مزید برآں، کشمیری معاشرے کی ثقافتی اور فلسفیانہ بنیادیں، بشمول بدھ مت کے نظریات اور ٹریکا روایت، نے خواتین کی فکری سرگرمیوں اور مذہبی طریقوں میں شرکت کو آسان بنایا۔ اگرچہ یہ مطالعہ کشمیر میں خواتین کے کثیر الجہتی کردار کی ایک جھلک فراہم کرتا ہے، مزید تحقیق جس میں آثار قدیمہ کے نتائج اور فنکارانہ نمائندگی جیسے متنوع ذرائع شامل ہوں، قدیم معاشروں میں صنفی حرکیات کی زیادہ نفیس تفہیم پیش کر سکتی ہے۔ آخر کار، کشمیر کی تاریخ میں خواتین کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے، یہ مطالعہ تاریخی بیانیوں کی تشکیل میں خواتین کی آوازوں کو تسلیم کرنے اور ان کو نمایاں کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

☐☐☐

Aadil Hussain Bhat
Shaikh-ul Aalam Centre for Multidisciplinary Studies
University of Kashmir
Srinagar-190006 (J & K)
Mob: 6005796425

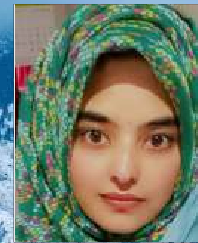

روحی جان

اردو ادب اور جموں وکشمیر کی خواتین

خواتین ہمارے سماج کا ناگریز حصہ ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف پوری دنیا فراخدلی اور کشادہ ذہنی کے ساتھ کررہی ہے۔ کسی بھی ملک کے افراد کی تہذیبی وتمدنی صورت حال، علمی وادبی کاوشیں سیاسی وسماجی اورفنی خصوصیات جیسے کارناموں کی تاریخ خواتین کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ مرد کے وجود ہی سے عورت کا وجود بنایا گیا تاکہ یہ ایک دوسرے سے سکون اور انس حاصل کرے۔ دونوں ایک دوسرے سے سبقت لینے کے بجائے دونوں اپنی اپنی استعداد کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون عمل کرکے تمدن کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ عورت کو بھی وہی انسانی حقوق حاصل ہے جو مرد کو حاصل ہیں لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر مذہب نے عورت کو جائز حقوق دیے ہیں، مگر تعلیم کی کمی اور مذہب سے لاتعلقی کے باعث بعض مرد اساس معاشرہ عورتوں پر ظلم وجبر کرتا رہا۔ چنانچہ جب بھی خواتین نے کچھ لکھنا چاہا تو ان کے موضوعات بھی یہی رہے۔ ابتدا میں خواتین کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب اہل علم و دانش نے قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا، جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی سوائے چند کے (بیسویں صدی کی خواتین) کسی اور کا ذکر نہیں ملتا۔ تاریخ ادب اردو پر نظر ڈالے تو معلوم ہوگا کہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں خواتین نے کچھ تخلیق نہ کیا ہو اس کے باوجود ان میں صرف چند کا ذکر تذکروں میں سرسری موجود ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک خواتین کا ادب کے میدان میں آنا محال تھا۔ تاہم بیسویں صدی کے وسط میں خواتین قلمکاروں نے وہ معرکہ انجام دیا کہ اردو ادب کی تاریخ ان کی شاعری، ناول اور افسانوں کے حوالے کے بغیر لکھنا ممکن نہیں رہا۔

ٹھیک اسی طرح جب ہم جموں وکشمیر کی اردو ادب کی بات کرتے ہیں تو یہاں بھی اردو ادب کی تاریخ پر جتنی کتابیں لکھی گئیں جیسے ''کشمیر میں اردو''، ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب'' اور ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' ان میں کسی بھی خواتین ادیبہ یا شاعرہ کا سرے سے ذکر تک نہیں ہے۔ جب کہ لل دید نے بہت پہلے کشمیری زبان میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا ہے۔

''جموں وکشمیر کی پہلی شاعرہ اور پہلی روحانی بزرگ خاتون لل دید چودھویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھیں۔ ان کا جنم عبدالوہاب شائق نے اپنی منظوم تاریخ

کشمیر میں 35۔1334 لکھا ہے۔''1

لل دید کے بعد حبہ خاتون، ارنی مال نے بھی کشمیری میں اور روپا بھوانی نے اردو آمیز ہندی میں مرد کے ظلم وستم اور عورت کی بے بسی کا اظہار کیا ہے۔لیکن جب اردو ادب کی بات کرتے ہیں تو اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ زینب بی بی محجوب ہے جن کا نعتیہ مجموعہ ''گلبن نعت'' میں تقریباً 29 نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔فرید پربتی ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔

''ان کی شاعری عقیدتی شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ان کے یہاں جذباتی وفور گداز اور پاکیزگی بدرجہ اتم موجود ہے۔''2

"ان میں جن شاعرات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں ترنم ریاض کا "پرانی کتابوں کی خوشبو" اور "زیر سبزہ محو خواب" شبنم عشائی کے مجموعے "من میں جمی برف، اکیلی" ہیں۔نصرت آرا چودھری کا "ہتھیلی کا چاند"، صاحبہ شہریار کے تین مجموعے "شاخ لرزاں، برگ چنار، آگہی کا در" وغیرہ مجموعے ایسی معتبر خواتین کے ہیں جنھوں نے روایتی شاعری کا پاس رکھتے ہوئے جدید تر رجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ان کے نزدیک آزاد نظم ایسی پسندیدہ صنف رہی جس کے تحت انھوں نے کشمیر کے حالات، عوام پر ہو رہے ظلم و زیادتیاں، حقوق آزادی کے حصول میں انسانوں کا قتل عام، رنج و الم، احساسات و جذبات کے علاوہ عورتوں پر ہو رہے ظلم و استحصال وغیرہ جیسے موضوعات کو بڑی بے باکی سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔"

زینب بی بی محجوب کے بعد شہزادی کلثوم کا نام آتا ہے۔ شہزادی کلثوم نے شاعری کے علاوہ کامیاب مضمون بھی لکھے ہیں جو ملک کے مختلف رسالوں میں تسلسل سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان رسائل میں عصمت، بنات اور خاتون مشرق قابل ذکر ہیں۔انھیں بابائے جمالیات شکیل الرحمان نے جموں وکشمیر کی پہلی غزل گو قرار دیا ہے۔3ان کے اسلوب کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''شہزادی کلثوم اچھی انشا پردازنہ صلاحیتوں کی مالک تھیں،لیکن ان صلاحیتوں کے شباب پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔''4

تاہم اردو ادب میں خواتین بیسویں صدی کی آخری دہائی میں رونما ہوئیں جنھوں نے قلم کے ذریعے نہ صرف اپنے جذبات و احساسات، سوچ وفکر اور نسوانی مسائل کو پیش کیا بلکہ فن اور ادبی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کو خوبصورت انداز میں قاری کے سامنے رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ان میں عائشہ مستور، رخسانہ جبین، ترنم ریاض، نصرت آرا چودھری، سیدہ نسرین نقاش اور شبنم عشائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ پروین راجہ، نرگس ستارہ، نگہت فاروق نظر، سلمیٰ فردوس، روبینہ میر، اطہر ضیاء، نتاشا کول، نگہت صاحبہ، حنا خان اور ڈاکٹر رومانا بھی شعر کہتی ہیں۔

ان میں جن شاعرات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں ترنم ریاض کا ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' اور ''زیر سبزہ محو خواب''، شبنم عشائی کے مجموعے ''من میں جمی برف، اکیلی'' ہیں۔نصرت آرا چودھری کا ''ہتھیلی کا چاند''، صاحبہ شہریار کے تین مجموعے ''شاخ لرزاں، برگ چنار، آگہی کا در'' وغیرہ مجموعے ایسی معتبر خواتین کے ہیں جنھوں نے رواتیی شاعری کا پاس رکھتے ہوئے جدید تر رجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ان کے نزدیک آزاد نظم ایسی پسندیدہ صنف رہی جس کے تحت انھوں نے کشمیر کے حالات، عوام پر ہو رہے ظلم و زیادتیاں، حقوق آزادی کے حصول میں انسانوں کا قتل عام، رنج و الم، احساسات وجذبات کے علاوہ عورتوں پر ہو رہے ظلم واستحصال وغیرہ جیسے موضوعات کو بڑی بے باکی سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔خاص کر اپنی شاعری کو نسوانی مسائل اور نفسیات کا جامہ پہنایا ہے۔چند مثالے ملاحظہ ہو۔۔۔

تم کہتے ہو کہ نصف کبھی پورا نہیں ہوسکتا

ذرا آج تم غور سے دیکھو
میرے وجود کو ست رنگی پہلو کو
میں اک چھتنار پیڑ کی مانند
گھنا سایہ اور بھری شاخیں لیے
اپنی جگہ بھرپور ہوں
کہیں ماں ہوں، کہیں بہن
کہیں بیوی تو کہیں بیٹی
ملا کہیں دیوی کا درجہ
کہیں بنی بازار کی رونق
کبھی کسی مجنوں کی لیلی
تم ہی کہتے ہو میرے پیروں تلے جنت ہے
کیا یہ ست رنگی شخصیت لے کر بھی میں
ادھوری ہوں
نصف ہوں
اپنے آپ کو پورا کہنے والے تم کیسے پورا ہو سکتے ہو

(نکہت فاروق نظر، نظم کڑا سچ)

جبکہ تم ایک نصف سے جمے ہو!!!!
جو بھی چہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں
روز محشر سے کیا ڈرتے ہو
میرے آنگن میں سارے محشر ہیں

(نصرت آرا چودھری)

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے
اور آتی رہے بچوں کی صدا اندر سے
وہ میری طرح نہ بچوں کے لیے رو دے کہیں
اپنے چہرے پہ سجاتی ہوں ہنسی اس ڈر سے

(ترنم ریاض)

مختصراً یہ کہ کشمیری شاعرات ان نامساعد حالات کے باوجود دنیا کی باقی خواتین کی طرح شعر و ادب میں ایسے اقدامات سرانجام دے رہی ہیں جو بلاشبہ قابل فخر ہیں۔

جموں و کشمیر کی خواتین نے نہ صرف شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا بلکہ نثری ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے جن میں ڈاکٹر ترنم ریاض، نعیمہ مہجور، زنفر کھوکھر، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر نگہت نظر، واجدہ تبسم گورکھور، ڈاکٹر ممتاز کوثر، شبنم بنت رشید تبسم ضیا، میت کور، رافعہ ولی اور رافیعہ رسول مغموم وغیرہ ادبا قابل ذکر ہیں۔ ان کے تحریروں کا انداز اور مزاج ملک کے باقی خطوں/علاقوں میں لکھے جارہی تحریروں سے مختلف ہے کیونکہ یہاں حالات ہمیشہ دگرگوں رہے ہیں۔ مسلسل رونما ہونے والے ہنگامی واقعات، نوجوانوں کی گرفتاریاں، موت یا گمشدگی، جبر و استحصال، خوف و ہراس جیسے مسائل ان کی کہانیوں میں خاص طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ان خواتین قلمکاروں میں ترنم ریاض سرفہرست ہیں جو ایک شاعرہ، ناول نگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار اور محقق و نقاد کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ان کے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں تنگ زمین، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، نرگس کے پھول، صحرا ہماری آنکھوں میں کے علاوہ ناولٹ مورتی اور برف آشنا پرندے بڑی اہمت کے حامل ہیں جن میں احساسات اور جذبات کے واضح نمونے ملتے ہیں۔

دوسرا اہم نام نعیمہ مہجور کا ہے جو بحیثیت افسانہ نگار پوری دنیا میں مشہور ہوئی۔ انھوں نے 'دہشت زادی' کے نام سے ناول لکھ کر اس صنف میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی کہانیوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دے کر ان کے سیاسی و سماجی حالات و مسائل کو پیش کیا تو وہیں انھوں نے آج کی تعلیم یافتہ لڑکی کی بے باکی و سرکشی کو بھی اجاگر کیا ہے۔

اسی طرح سیدہ نسرین نقاش بھی کشمیر کی ان قلمکاروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے قلم سے بیک وقت شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کی ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں متوسط طبقے کو پیش کیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'دشت تنہائی' شائع ہو چکا ہے۔

جن کشمیری خواتین نے اپنی پہچان ادبی دنیا میں بنا لی ان میں زنفر کھوکھر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے کہانی لکھنے کی

شروعات اپنی مادری زبان سے کی اور بعد میں اردو کی طرف راغب ہوئی ۔اردو میں ان کی پہلی کہانی ''نصیحت'' طنز و مزاح پر مبنی ہے۔ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں''خوابوں کے اس پار،عبرت اور ہم سب ایک ہیں''۔ان کے افسانے رسائل و جرائد میں مسلسل چھپتے رہے ہیں ۔ان کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں،موضوعات میں تنوع ہے۔ انھوں نے عورت کے مسائل ،ذات پات،رشوت خواری،عورتوں کی بے بسی ولاچاری پہ قلم اٹھایا ہے۔رسالہ'شاعر'ممبئی نے ان پر خصوصی نمبر بھی نکالا ہے اور افتخار امام صدیقی کے ساتھ ان کا ادبی مکالمہ بھی شائع کیا ہے۔

ان خواتین میں ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔وہ فارسی زبان کی پروفیسر رہی ہیں۔انھوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور کالمز بھی لکھتی رہی ہیں ۔وہ اس کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ان کی کہانیوں میں عورت بحیثیت ماں،بہن،بیوی اور سہیلی کے رنگ میں دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے معاشی بحالی،عورت و مرد کے تعلقات،مخصوص تہذیبی تناظر وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھا ہے۔

دورحاضر کی خواتین میں سیدہ نگہت نظر بھی ایک اہم نام ہے۔وہ شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ان کی افسانہ نگاری سے متعلق افسانہ نگار نورشاہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''ریاست جموں وکشمیر میں خواتین اردو قلم کاروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے سیدہ نگہت نظر صاحبہ ابھی ادبی منزل کی تلاش میں ہیں۔منزل اگرچہ دور ہے لیکن تخلیقی سفر جاری ہے۔اس تخلیقی سفر کے دوران وہ دوسرے اہم اور بلند پایہ قلم کاروں کی تخلیقات کا مطالعہ بھی کریں۔مجھے یقین ہے ایسا کرنے سے ان کی سوچوں میں نکھار آئے گا اور ذہن کی راہیں کھل جائیں گی۔''5

ان کے افسانوں میں سماج کی مصیبت زدہ عورت کے جذبات و احساسات،عورت کے مختلف روپ کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ان کے اکثر افسانوں میں تانیثی رنگ حاوی ہے۔نسائی نفسیات کی پیش کش اور سماجی نا انصافی کی شکار عورتوں کے لیے صدائے احتجاج ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔

افسانوی ادب میں واجدہ تبسم بھی ایک اہم نام ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔تبسم ضیا کا نام بھی افسانوی دنیا میں بہت اہم ہے۔انھوں نے سماج کی بے ہودہ رسومات، جہیز جیسی لعنت،عورت کے ساتھ استحصال جیسے مسائل پر لکھا ہے۔عہد حاضر کے دیگر خواتین قلمکاروں میں شبنم بنت رشید،عذرا بنت گلزار، رافعی ہولی،میتکور،زبیدہ گلزار،بلقیس مظفر اور شمیمہ صدیقی قابل ذکر ہیں۔

جیسی کشمیر کی خواتین قلم کاروں نے اپنے گردوپیش، اپنے مادر وطن کی تہذیب و ثقافت،عوام پر ہو رہے ظلم و استحصال کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ان خواتین کے یہاں تانیثی فکر دھیمے لہجے میں ہے۔انھوں نے عورت کے مسائل،ان پر ہو رہے ظلم و استحصال، عورتوں کے جائز حقوق نہ ملنے کے خلاف جو غم وغصہ اور آواز بلند کی ہے وہ نہ مغربی خواتین کی تانیثی تحریک کی طرح جارحی مزاحمت کی حامل ہے اور نہ ہی یہ خواتین مرد کے وجود کے انکار کے منفی رجحان سے متاثر ہیں بلکہ مرد کو اپنا محافظ جانتی اور مانتی ہیں۔

حواشی

1۔لل دید:کشمیر کی مشہور ومعروف شاعرہ ، جے لال کول،ترجمہ۔موتی لال ساقی،ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی،1985،ص16

2۔ہمارا ادب۔جموں وکشمیر معاصر نسائی ادب نمبر،ڈاکٹر گلزار احمد وانی،ص۔153

3۔یادگار کلثوم،مرتب اکبر جے پوری 1962،ص۔25۔22

4۔کشمیر میں اردو (حصہ سوم) ص۔108،اکیڈی آف آرٹ،کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر جموں

5۔ہمارا ادب۔ریاست کی معاصر خواتین قلم کار۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ص۔119

□□□

Dr. Rohee Jan
Lecturer (Contractual)
GDC Chararisharif
Shopian-192303 (Jammu and Kashmir)
janruhijan2020@gmail.com

اردو ادب میں خودنوشت

فرحین خانم

اردو ادب میں جو پہلی خودنوشت سمجھی جاتی وہ ہے جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' (کالا پانی) ہے۔ یہ خودنوشت 1885 میں جنگ آزادی کے دوران لکھی گئی۔

شورش دوراں حمیدہ سالم کی ایک مشہور آپ بیتی ہے۔حمیدہ سالم لکھنؤ کے ایک قصبہ ردولی کی رہنے والی تھیں جن کی پیدائش 1922 میں ہوئی۔حمیدہ سالم اردو کے مشہور شاعر اسرارالحق مجاز کی بہن تھیں۔ اردو شعر وادب سے دلچسپی ان کو خاندانی ورثہ میں ملی جس سے ان کو سخن فہم اور مایہ ناز ادیبہ کا مقام حاصل ہوا۔حمیدہ سالم اکنومکس کی طالبہ تھیں۔انھوں نے علی گڑھ سے 1942 میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور 1947 میں ایم اے کیا۔علی گڑھ سے ہی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئیں۔ اور کئی ممالک کا سفر کیا۔ بعد ازاں علی گڑھ میں ملازمت بھی اختیار کی۔حمیدہ سالم کی اردو ادب میں چار تصنیف منظر عام پر آئیں ان کی سب سے پہلی تصنیف ''شورش دوراں'' 1995 میں ادب پبلی کیشنز میں شائع ہوئی اور دوسری تصنیف 'ہم ساتھ' تھے 1999 میں انجمن ترقی ہند سے شائع ہوئی اور تیسری تصنیف ''ہر دم رواں ہیں زندگی' 2004 میں شائع ہوئی اور چوتھی تصنیف پرچھائیوں کے اجالے 2008 میں شائع ہوئی۔

حمیدہ سالم کی تصنیف شورش دوراں کے پانچ ابواب میں خاندانی اور سماجی سیاسی ومعاشرتی زندگی کا پس منظر ہے اور اس میں اپنے بھائی مجاز کے دو رخ دکھائے گئے ہیں۔ پہلا بہت زیادہ بادہ و جام کا مرتکب شاعر اور دوسرا بہت زیادہ ایماندار انسان۔حمیدہ سالم کے دوسرے بھائی انصار ہروانی جن کی دلچسپی سیاست سے تھی انھوں نے مسلم طبقہ کی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے آگے بڑھایا۔اس نے اپنی بہنوں کی تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دی۔) حمیدہ سالم کی آگے کی پڑھائی میں بھرپور ساتھ دیا۔ان سب کا تذکرہ حمیدہ سالم کی اس خودنوشت میں ہے۔اس کے علاوہ حمیدہ سالم کی اس خودنوشت میں ایک جاگیردارانہ طبقے کے زوال کی داستان بھی ہے کیونکہ حمیدہ سالم کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ان کی اس آپ بیتی میں سیاسی سماجی ومعاشرتی حالات وواقعات کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے ہے۔

عصمت چغتائی ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئیں جہاں مسلم عورتوں پر بہت ظلم کیے جاتے تھے ان کو ہر اعتبار سے کم تر سمجھا جاتا تھا اور مرد انھیں غلام بنا کر رکھتے تھے۔اس دور میں تعلیم نسواں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔خاص کر اسی دور پر نظر رکھتے ہوئے عصمت چغتائی نے ان ساری مصیبتوں کا سامنا کیا اور مظلوم عورتوں کو مصیبت

سے باہر نکالا عصمت چغتائی کے والد نے جج ہونے کی حیثیت سے ان پورا ساتھ دیا اسی دور میں علی گڑھ میں عبداللہ کالج کی شروعات ہوئی۔عصمت چغتائی نے وہاں سے ایف اے کی ڈگری حاصل کی لیکن بی اے لکھنؤ کے آئی ٹی کالج سے کیا۔عصمت چغتائی اردو کی پہلی feminist بھی رہی ہیں اور اسی موضوع پر مختلف افسانے تخلیق کیے اور اسی کے ذریعے حقوق نسواں کے لیے آواز اٹھائی۔

عصمت چغتائی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے عورتوں کی آزادی کو موضوع بنایا۔ان کے زیادہ تر افسانوں اور ناولوں میں عورتوں پر کیے گئے ظلم و زیادتی کی عکاسی ہے مثلاً ''ٹیڑھی لکیر، لحاف'، وغیرہ۔اس کے علاوہ عصمت چغتائی نے ایک خودنوشت بھی تحریر کی جس کا عنوان'' کاغذی ہے پیرہن'' ہے اس خودنوشت میں 14 ابواب ہیں لیکن یہ پوری نہیں ہو پائی اور یہ خودنوشت کتابی شکل میں آنے سے پہلے ماہنامہ رسالہ آج کل میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔

عصمت چغتائی نے اس خودنوشت میں علی گڑھ ،لکھنؤ بریلی اور راجستھان جیسے شہروں کی تہذیبی سیاسی سماجی و معاشرتی زندگی کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔خاص کر راجستھان کے جاگیردارانہ نظام رسم و رواج اور وہاں کے ماحول کو بڑی باریک بینی سے پرکھا ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک عنوان''سونے کا اگلدان'' کے نام سے لکھا جس میں راجستھان کے جاگیردارانہ نظام کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔وہ بتاتی ہیں کہ محل کی رانیوں سے لے کر بیواؤں تک سونے کے اگلدان میں تھوکا کرتی تھیں اور وہ اگلدان نوکرانیوں کے پاس ہمیشہ رہتا تھا۔

اخترالایمان اردو شاعری میں ایک ممتاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔اخترالایمان کی شاعری بھی نہایت دانشور اور فکر انگیز ہے۔اس کے علاوہ وہ ایک خودنوشت نگار بھی ہیں۔ان کی داستان حیات''اس آباد خرابے میں'' کے نام سے کافی مشہور ہے جس کا سن اشاعت 1999 ہے۔اخترالایمان نے اس آپ بیتی میں اپنے بچپن کے حالات و واقعات سے لے کر تعلیمی سفر اور والد کے ساتھ کیے گئے سفر کو بہت خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔اخترالایمان کی زندگی میں مالی پریشانیاں بہت زیادہ تھیں۔انھوں نے سب سے پہلے اپنی زندگی میں مزدوری کی اس کے بعد لکھنے کی ابتدا کی اور بعد ازاں علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں سے پھر ممبئی پہنچے اور اس طرح سے اخترالایمان نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ان سب کا تذکرہ ان کی خودنوشت میں ہے۔اخترالایمان کی یہ آپ بیتی اتنی زیادہ مقبول اس لیے ہوئی کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی کے وہ تمام حالات و واقعات اچھے برے امیری غریبی سب کو بہت اچھے انداز میں بیان کر دیا ہے۔لہذا ان کی خودنوشت میں کوئی جھوٹ یا نامکمل بات نہیں ملتی۔اخترالایمان ایک سیدھے سادھے اور ایماندار شخص تھے۔اس لیے ان کی آپ بیتی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو بہت مصیبت و کرب کے ساتھ گزارا جس کا تذکرہ ان کی آپ بیتی کے پیش لفظ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اخترالایمان کی خودنوشت زبان و بیان کے حوالے سے نہایت ہی دلکش ہے۔انھوں نے آپ بیتی کے فن کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ان کی زبان بہت سادہ اور عام فہم ہے اور یہ آپ بیتی اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار کافی کامیاب نظر آتی ہے۔اس کا سبب یہ بھی ہے کہ اس آپ بیتی میں flash back کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔

کلیم الدین احمد نے اردو ادب میں کافی شہرت پائی۔وہ اردو ادب کے نامور نقاد مانے جاتے ہیں ان کی زیادہ تر کتابیں تنقید پر شائع ہوئیں ان کی مشہور کتابوں میں ''اردو شاعری پر ایک نظر' عملی تنقید' وغیرہ ہیں۔اس کے علاوہ ان کی ایک بہترین خودنوشت بھی ہے''اپنی تلاش میں''۔اس خودنوشت میں مصنف کے حالات و واقعات کا ذکر ہے مثلاً ان کے بچپن سے لے کر ان کی تعلیم تک کے واقعات۔کلیم الدین احمد کی یہ آپ بیتی تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس خودنوشت میں شروع کے ابواب میں خاندان، اپنا علاقے پٹنہ کا ماحول وہاں کے علمی تہذیبی اور معاشرتی حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔اصل میں کلیم الدین احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ان کا خاندان ادبی ماحول سے تعلق رکھتا تھا جس سے ان کا رجحان اردو ادب کی طرف بڑھتا گیا۔

کلیم الدین احمد کی آپ بیتی میں کھیل سے متعلق بھی گفتگو ہے۔مثلاً انھوں نے بچپن میں کبڈی، گلی ڈنڈا، پتنگ، فٹ بال،

شطرنج، کشتی اور تاش جیسے کھیل کھیلے۔ بعد ازاں کلیم الدین احمد نے اس عہد کے شاعروں اور اپنے نانا حکیم عبدالحمید اور شاد عظیم آبادی کا بھی ذکر بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے۔ کلیم الدین احمد ایسی فلسفیانہ گفتگو کرتے تھے اور ان کی فلسفیانہ بحث ہر جگہ نظر آئی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس خودنوشت میں اپنی ذاتی زندگی کے حالات بہت کم تحریر کیے ہیں جس سے ان کی شخصیت بہت کم نظر آئی ہے کیونکہ آپ بیتی ایک ایسی صنف ہے جس میں اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنا عیب سمجھا جاتا ہے۔

"قرۃ العین حیدر کی کوئی باضابطہ آپ بیتی نہیں ہے۔ ان کے زیادہ تر ناولوں میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے "کار جہاں دراز ہے" یہ ایک باضابطہ طور پر سوانحی ناول مانا جاتا ہے جس میں انھوں نے خاندانی پس منظر اور اپنے ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے قرۃ العین حیدر اور ان کے خاندان کی زندگی کی تاریخ معلوم ہوتی ہے اور مصنفہ نے اس خود نوشت میں تہذیب و تمدن رسم و رواج کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں جو کردار بیان کیے گئے وہ ایک ناول کی طرح ہیں۔ اس لیے مصنفہ اس کو سوانحی ناول قرار دیتی ہیں۔"

قرۃ العین حیدر کی پیدائش 1927 کو علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سجاد حیدر یلدرم ہے جنھوں نے اردو ادب میں کافی شہرت پائی اور متعدد افسانے تحریر کیے۔ قرۃ العین حیدر کے آبا و اجداد نے آزادی کے بعد پاکستان کا رخ کر لیا تھا بعد ازاں قرۃ العین حیدر نے پاکستان میں 1959 میں "آگ کا دریا" ناول تحریر کیا تو اس ناول پر بہت ہنگامہ ہونے کی وجہ سے قرۃ العین حیدر ہندوستان چلی آئیں۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک مایہ ناز ادیبہ ہیں جنھوں نے صرف ناول میں ہی طبع آزمائی نہیں کی بلکہ تراجم بھی کیے۔ ان کے سب سے زیادہ مقبول و معروف ناول "آگ کا دریا" آخر شب کے ہم سفر"، "میرے بھی صنم خانے" کافی دلچسپ ہیں جس کی وجہ سے انھیں گیان پیٹھ انعام سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ پدم شری انعام 1985 میں اور پدم بھوشن ایوارڈ 2005 میں ملا قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ورجینا وولف کے نام سے بھی جانی جاتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی کوئی باضابطہ آپ بیتی نہیں ہے۔ ان کے زیادہ تر ناولوں میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے "کار جہاں دراز ہے" یہ ایک باضابطہ طور پر سوانحی ناول مانا جاتا ہے جس میں انھوں نے خاندانی پس منظر اور اپنے ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے قرۃ العین حیدر اور ان کے خاندان کی زندگی کی تاریخ معلوم ہوتی ہے اور مصنفہ نے اس خودنوشت میں تہذیب و تمدن رسم و رواج کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں جو کردار بیان کیے گئے وہ ایک ناول کی طرح ہیں۔ اس لیے مصنفہ اس کو سوانحی ناول قرار دیتی ہیں۔

آل احمد سرور ایک نقاد، ادیب اور ایک استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تحقیقی و تنقیدی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً "نئے پرانے چراغ، تنقید کیا ہے" "ادب اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک وغیرہ۔ ان سب کے علاوہ ادب کے مختلف شعبوں اہم کام کیے ہیں۔ آل احمد سرور کی مشہور خودنوشت "خواب باقی ہے" جس کی اشاعت 1991 میں ہوئی۔ اصل میں سرور صاحب کو اپنی زندگی کی روداد لکھنے کی کوئی چاہ نہیں تھی۔ ان شاگرد کے اصرار پر یہ داستان حیات لکھی گئی جو کافی مشہور بھی ہوئی۔

لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہیں چل سکا کیونکہ آل احمد سرور کا کہنا تھا کہ مجھے بول کر لکھوانے میں تھوڑی دشواری پیدا ہوتی ہے اس کی عادت نہیں ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے وہ تمام نشیب و فراز ہیں جو ان کی زندگی میں پیش آئی۔ اس آپ بیتی میں مصنف کی علمی ادبی و ثقافتی زندگی کی روداد جذباتی انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے اپنے دور کے ادبی مراکز علی گڑھ، رام پور اور لکھنؤ کی سیاسی سماجی و معاشی صورت حال کو قلم بند کیا ہے۔

آل احمد سرور نے اس آپ بیتی میں اپنے خاندان اور والد کے ساتھ یوپی کے تمام شہروں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے ان کی آپ

بیتی سے معلوم ہوتا ہے ان کی تعلیم آگرہ سے ہوئی۔اس کے بعد علی گڑھ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔بعدازاں اردو میں بھی ایم اے کیا اور اسی شعبے میں ملازمت اختیار کی۔

کلیم عاجز اردو شعروادب میں ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

کلیم عاجز 1920 میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔گریجوشن اور ایم اے کی ڈگری پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور وہیں پر ملازمت اختیار کی۔

کلیم عاجز نے 1976 میں اپنا پہلا مجموعہ شائع کیا۔اس کے علاوہ نثر سفرنامہ،نظمیں اور غزلوں میں بھی کمال حاصل کیا۔اس کی وجہ سے کلیم عاجز کو پدم شری انعام سے بھی نوازا گیا۔

کلیم عاجز کی مشہور آپ بیتی ''ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ'' کے نام سے ہے اس خودنوشت میں 100 صفحات شامل ہیں ۔اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے خاندان کے حالات و واقعات اور 1947 کی لڑائی کے واقعات کو قلم بند کا ہے۔یہ ایک شخصی آپ بیتی مانی جاتی ہے اور اس آپ بیتی میں کلیم عاجز نے اپنی دکھ بھری داستان کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ اپنے بچپن کے حالات وواقعات کا نقشہ کھینچا ہے۔

Farheen Khanam
Department of Urdu
Assam University
Girls Hostel.1 Block,
C Room No 28
Silchar-788011 (Assam)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

قدسیہ انجم علیگ

سینکڑوں زخم سہتی رہی زندگی
موت سے پھر بھی لڑتی رہی زندگی

دور حاضر میں سچائی کے نام پر
جھوٹے وعدوں پہ چلتی رہی زندگی

نام جو ریت پہ تیرا لکھتے رہے
اس کو اکثر مٹاتی رہی زندگی

دوستوں نے جو دھوکے دیے عمر بھر
ان کو تحفے سمجھتی رہی زندگی

جانے کیسا یہ برتاؤ ہے پیاس کا
بارشوں میں بھی سوکھی رہی زندگی

آرزوئیں ملا کر سبھی خاک میں
ہر قدم پر رلاتی رہی زندگی

عشق گھلتا رہا ہم تڑپتے رہے
عمر بھر آہ بھرتی رہی زندگی

نفرتیں ایسی انجم بھری زیست میں
موت کی چاہ کرتی رہی زندگی

Dr. Qudsia Anjum
C/o. Dr. M. Ayub
Pul Kambohan
Saharanpur-247001 (U.P)

پختہ کاری

نورینہ پروین

عمر پہ نہ جائیں میری
تجربہ ساٹھ کا رکھتی ہوں
شکل دیکھ کر
دماغ پڑھ لیتی ہوں
عادتیں اکثر دیکھی ہے بدلتے میں نے
فطرت کسی قدر بدلتی نہیں لیکن!
سانپ کے افعئی میں زہر ہوتا ہے
یہ سنا ہے میں نے
آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں کہ ہے تریاک بہت؟
اسے میری عقل پہ محمول نہ کیجئے
کچھ شناسائی میری بھی ہے اس دنیا سے!
ہر رنگ کو دیکھا ہے بدلتے میں نے
بس اک سیاہ رنگ ہے جو ہمیشہ ہی رہا
صبح کی ایک کرن جب بھی پڑی ہے مجھ پہ
اپنے اطراف میں اک بھیڑ جمع دیکھی ہے
وقت جو پہنچا ہے تاریکی کو
تنہا پایا ہے۔۔۔شام کی اندھیاری میں!
عمر پہ نہ جائیں میری
تجربہ ساٹھ کا رکھتی ہوں!!

Dr. Nurina Parveen
Village Post– Kasenda, Block-Chail
District– Kaushambi-212202
Email ID: parveennurina@gmail.com

سعیدہ شکیل

میری ماں میری محبوبہ

دل سے خوش ہوتی تھی وہ۔۔
ہر لمحہ دعا دیتی تھی وہ۔۔۔۔۔
خدا تیری عمر دراز کرے
ہر مقام پر خدا تجھے
کامیاب کرے
دور ہر بلا رہتی تھی
میرے پاس جب وہ ہوتی تھی
جو اٹھ گیا سایہ ماں کا
موسموں کی زد میں آ گئی
ہوں میں/ مانند اک پتے کے
مرجھا گئی ہوں میں/ ماں کا پیار ہوتا ہی
کچھ ایسا ہے/ تپتی دھوپ میں
گھنے چھاؤں جیسا/ اس کے بغیر جیون سونا لگتا ہے
بن پانی کے درخت جیسا
میرے دنیا میں واحد محبوبہ ماں تھی،
شاید/واحد محبوبہ ماں ہی ہوتی ہے/ جو بے لوث محبت کرتی ہے
لیکن/ اب وہ میرے پاس نہیں،
جا چکی ہے وہ/ دور کہیں
ہوا قسمت میں تو ملیں گے
کہیں،،،،
ہاں شاید جنت میں۔۔

Saeeda Shakeel
100/321B Colonel ganj
Kanpur Nagar- 208001 (U.P)
Email_saeedashakeel92@gmail.com

شمشاد بیگم سنبل

میری لختِ جگر

ہو مبارک شریکِ سفر، میری لختِ جگر نازنیں
پاک رشتوں کی یہ رہگزر، میری لختِ جگر نازنیں
بن کے دلہن چلی پی کے گھر، میری لختِ جگر نازنیں

تیری ہستی کا دامن سدا جگمگاتا رہے نوٗر سے
چہرہ گلنار آئے نظر مسکراتا ہوا دوٗر سے
سر پہ ہو تیرے تاجِ سحر، میری لختِ جگر نازنیں

نرم اور شیریں گفتار سے، اپنے اخلاق و کردار سے
ناؤ کھینا ہے سسرال کی ، بیٹی الفت کی پتوار سے
ہے یہ تعلیمِ خیر البشرؐ میری لختِ جگر نازنیں

غم زدہ دن کے حالات سے یا اذیت بھری رات سے
ہاتھ شوہر کا چھوٗٹے نہیں، وسوسے میں ترے ہاتھ سے
معرکہ ایسے کرلینا سر، میری لختِ جگر نازنیں

رہ کے پابندِ شرم وحیا ، سارے رشتوں سے کرنا وفا
شر کی ظلمت میں بھی بانٹنا، خیر کی صدقِ دل سے ضیا
خم نہ ہو تیرے بابُل کا سر،میری لختِ جگر نازنیں

جشنِ قربت مناتی رہو، عہدو پیماں نبھاتی رہو
دل کی کلیاں کھلاتی رہو، پیار کے نغمے گاتی رہو
ہے دعا میری باچشمِ تر،میری لختِ جگر نازنیں

Shamshad Begum Sumbul
B-4, Al-yasin Apartment
Old Purulia Road, Zakir Nagar (East)
P.O.:Mango,Jamshedpur-831012 (Jharkhand)

نسترن احسن فتیحی

سرخ گلاب

"میں آپ کو دیدی کہہ سکتی ہوں؟" مال روڈ پر ٹہلتے وقت شوخ آنکھوں والی چنچل سی لڑکی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔؟ مگر تم۔۔؟" اس نے مسکرا کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"میں اندر جیت کور، ویسے آپ مجھے اندو کہہ سکتی ہیں۔"

"میں مینو۔۔ چند دن پہلے ہی اس شہر میں آئی ہوں۔"

"جانتی ہوں دیدی اس شہر میں ہی نہیں بلکہ ہماری ہی بلڈنگ کے نیچے والے فلیٹ میں آپ رہتی ہیں۔"

"اچھا"۔۔اس انکشاف پر دونوں دل کھول کر ہنسیں اس طرح اس اجنبی اور نئے شہر میں اندو اس کی پہلی دوست بنی۔ وہ اس سے پانچ یا چھ سال چھوٹی ہوگی مگر اپنی باتونی فطرت سے اس نے اجنبیت کی ہر دیوار کو گرا دیا اور دونوں جلد ہی گہری دوست بن گئیں۔

مینو ایک عام سے گھر کی عام سی لڑکی تھی ابھی ایم اے فرسٹ ائر میں تھی اور ہر عام لڑکی کی طرح اس کی آنکھوں نے کچھ خاص سپنے بن رکھے تھے۔ ایک تو یہ عمر ہی دھنک رنگ سپنے دیکھنے کی تھی اس پر سے اس کی خداداد خوبصورتی، سنہرا رنگ، نمکین سا نقش، نازک سا سراپا اور بڑی بڑی سیاہ ہرنی سی آنکھیں، جو نظر اٹھتی وہ تحسین کی ہوتی۔ اسے لگنے لگا وہ عام سے گھر میں بڑی خاص سی لڑکی ہے اور اس کے لیے کوئی شہزادہ سا لڑکا کسی دن ایک سرخ گلاب لے کر آئے گا۔ اور اسے اپنا بنا لے گا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنی پڑھائی کرنے کے ساتھ شہزادے کا انتظار بھی کرتی۔ لیکن ایک دن اچانک اس کی پر سکون سی زندگی میں تلاطم پیدا ہوا، کسی شہزادے کے آنے سے پہلے 22 سال کی لاابالی مینو کے لیے 35 سال کے سنجیدہ اور متین سے شخص کا رشتہ آ گیا۔ گھر والے خوش تھے یونیورسٹی ٹیچر، جسے جہیز بھی نہیں چاہیے،، دیکھنے میں بھی خوبرو۔۔ کسی کو کوئی وجہ انکار کی نظر نہ آئی۔ مینو کا مسلسل انکار کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، آخر کار سب کے دباؤ میں وہ اپنی ضد پر قائم نہ رہ سکی۔ اس کی نظر میں ایک ہی کمی تھی کہ وہ اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا نہ تھا۔ مگر دوسری اتنی خوبیاں تھیں کہ اس ایک کمی کو نظر انداز کرنا پڑا۔ وہ ہماچل کی کسی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا اور شملہ جیسے پرفضا مقام پر رہتا تھا۔ اسمارٹ، سنجیدہ، پڑھا لکھا، پروقار اور اپنی عمر سے کم کا دکھتا، سب اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے۔ مگر مینو کنفیوز رہی۔ مینو کو شادی سے پہلے اس سے ملنے کا موقع بھی دیا گیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں دونوں ملے، تو مینو کو لگا وہ واقعی اتنا برا نہیں مگر کچھ کمی تو تھی جو اسے کھٹکتی رہی۔ وہ گھر آئی تو اپنی دوست جیسی بھابھی کے پوچھنے پر بتایا۔

"اچھا ہے پر ویسا نہیں۔۔"

کیسا مینو؟

"مجھ سے ملنے آ رہا تھا تو ایک سرخ گلاب نہیں لا سکتا تھا کوئی

بو کے ہی لے آتا۔"

"اوہ ہو تو تجھے شوہر نہیں محبوب چاہیے۔" بھابھی نے اس کی چٹکی لی۔

"اب آپ جو کہیں، وہ نہ میری طرف دیکھ رہا تھا، نہ میرے لیے کار کا دروازہ کھولا، نہ ہی میرے لیے کرسی کھینچی۔ بس کچھ نہ پوچھیں میرا موڈ خراب ہو گیا۔"

ان ھی خدشات اور نصیحتوں کے ساتھ وہ بیاہ کر بلال کے ساتھ نئے شہر میں آگئی۔کوئی کمی نہ ھوتے ھوئے بھی اسے لگتا کہ کسی نے اسے اس کے سہانے سپنوں کے درمیان سے اغوا کر لیا ہے۔پھر بھی وہ شوھر کے مزاج کو سمجھنے اوراس نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتی۔بلال کو بہت کم بات کرنے کی عادت تھی، مگر اپنے تئیں وہ اس کا پورا خیال رکھتا۔بس مینو کو غصہ تب آتاجب وہ کبھی اس کے ساتھ کھیں جانے کے لیے اپنا کوئی بھڑکیلا لباس زیب تن کرتی یا کوئی فراک سوٹ پھنتی تو وہ آنکھیں سکوڑ کر بس اتنا کھتا "ساڑی پھن لو ساڑی میں زیادہ گریس فل لگتی ھو۔" وہ چڑھ جاتی مگر اس کی سنجیدگی دیکھ کر کچھ بولنے کی ھمت نہ ھوتی۔ اسے وہ بال کھلا نہ رکھنے دیتا کھتا جوڑا کر لو کھلے بال میں بچّی سی لگتی ھو۔ رفتہ رفتہ اسے بلال کی بات سمجھ میں آتی گئی۔

"اے ہے لڑکی اپنے بھائی کو کبھی نہیں دیکھا ہے، ہر وقت حکم چلاتے ہوئے۔ یہ شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں، فلم اور سیریل دیکھ کر تیرا تو دماغ ہی چل گیا ہے۔"

"بھابھی۔۔کیا اصلی زندگی میں ویسے لوگ نہیں ہوتے۔"

"کیا پتہ؟ ہوتے ہوں گے۔۔مگر یہ تو پکّی بات ہے کہ کوئی شوہر ایسا فلمی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی بیویاں باغ میں دوڑ دوڑ کر گانا گاتی ہوئی۔ سمجھی! خیالوں کی دنیا سے نکل آؤ۔" انھوں نے قہقہہ لگایا۔

"پیار کے بغیر دو لوگ شادی کیسے کر سکتے ہیں؟۔"

"یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے رکھتے دونوں میں پیار ہو جاتا ہے۔"

ان ہی خدشات اور نصیحتوں کے ساتھ وہ بیاہ کر بلال کے ساتھ نئے شہر میں آ گئی۔ کوئی کمی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے لگتا کہ کسی نے اسے اس کے سہانے سپنوں کے درمیان سے اغوا کر لیا ہے۔ پھر بھی وہ شوہر کے مزاج کو سمجھنے اور اس نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتی۔ بلال کو بہت کم بات کرنے کی عادت تھی، مگر اپنے تئیں وہ اس کا پورا خیال رکھتا۔ بس مینو کو غصہ تب آتا جب وہ کبھی اس کے ساتھ کہیں جانے کے لیے اپنا کوئی بھڑکیلا لباس زیب تن کرتی یا کوئی فراک سوٹ پہنتی تو وہ آنکھیں سکوڑ کر بس اتنا کہتا "ساڑی پہن لو ساڑی میں زیادہ گریس فل لگتی ہو۔" وہ چڑھ جاتی مگر اس کی سنجیدگی دیکھ کر کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اسے وہ بال کھلا نہ رکھنے دیتا کہتا جوڑا کر لو کھلے بال میں بچّی سی لگتی ہو۔ رفتہ رفتہ اسے بلال کی بات سمجھ میں آتی گئی۔

وہ اس کی طرح سنجیدگی اوڑھ کر رہنے لگی۔ بلال نے اسے کتابیں لاکر دیں کہ دن بھر فارغ رہنے سے بہتر ہے پڑھائی کرو، نئے سیشن میں ایڈمیشن کروا دوں گا۔ یہ بات اسے کچھ کچھ پسند آئی، کم از کم کچھ بننے کا خواب تو وہ اب بھی پورا کر سکتی ہے۔

لیکن سارا سارا دن تنہا اس سے بیٹھا نہ جاتا، وہ چاہتی کہ بلال اسے اچھی اچھی جگہوں کی سیر کرائے، دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے ساتھ چہل قدمی کریں مال روڈ پر گھومیں، آئسکریم کھائیں۔۔ مگر بلال کو تو اس کے ساتھ چلنے میں بھی شرم محسوس ہوتی، ارے ہر طرف میرے اسٹوڈنٹ ہیں، اس طرح اچھا نہیں لگتا۔ پھر اس نے بلال سے کوئی بھی توقع رکھنا چھوڑ دیا۔ تب اندو کی

دوستی نے اسے سہارا دیا۔ اگر وہ بلال کے ساتھ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگنے کی کوشش کرتی تو اندو کے ساتھ پانچ سال چھوٹی بن جاتی۔۔ اس کے ساتھ اس نے اس پہاڑی علاقے کا چپّہ چپّہ چھان مارا۔ بلال بھی مطمئن تھے کہ اندو جیسی بے ضرر لڑکی اس کی بیوی کا دل بہلائے رکھتی ہے۔ کبھی جھرنا، کبھی ندی، کبھی گھاٹی کی سیر کرتیں دونوں مست رہتیں۔ کسی درخت سے پلم اور گلم توڑتیں، کہیں سیب یا اخروٹ سے دوپٹے بھر لاتیں۔ کبھی چیڑ کے درختوں کے پھول جمع کرتیں اور اسے رنگ برنگے پینٹ کر کے سجاتیں۔ زندگی ایک سیدھے اور مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی کہ اچانک ندی کے شانت پانی میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی۔

”اچانک دونوں چونک کر ڈر گئیں۔۔ ایک روشنی سی چمکی تھی اور کئی بار چمکی تھی۔شروع میں تو انہیں اپنا وہم لگا، مگر پھر یقین ہو گیا کہ ان کے علاوہ یہاں پر کچھ تو ہے ، اس نے پہاڑی ریچھ کے قصّے سن رکھے تھے ، پلم کے گھنے پتّوں کے پیچھے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر اس گہری وادی کے سنّاٹے میں دونوں کو بری طرح ڈر لگا۔مینو نے جلدی سے کوٹ پہنا۔۔ بال پر سے برف جھاڑی اور ہیٹ لگا کر تیزی سے اندو کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف بھاگی۔دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کریں گی تا کہ ان کے اس طرح نکلنے پر کوئی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ گھر پہنچ کر جلد ہی مینو اس واقعے کو بھول گئی۔“

ٹھنڈ میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب ان دونوں لڑکیوں نے وادی میں گھومنا چھوڑ دیا تھا، سردیوں کے بعد مینو کا ایڈمیشن ہونا تھا اس لیے وہ اکثر اپنی کتابیں پھیلا کر برآمدے کی دھوپ میں بیٹھ جاتی۔ کبھی کبھی اندو آ جاتی اور شکایت کرتی کہ وہ اب اس کے ساتھ گھومنے نہیں جاتی کم سے کم ہم مال روڈ تک تو جا ہی سکتے ہیں۔ برف گرنے دو اندو میں نے کبھی برف باری نہیں دیکھی۔۔ برف گرے گی تو مجھے نیچے اس وادی میں لے جانا جہاں سے چاروں طرف صرف پہاڑ اور جھرنے نظر آتے ہیں۔۔ "ہاں دیدی، وہاں ضرور چلیں گے بہت پیاری جگہ ہے اور وہ ٹورسٹ پلیس نہیں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا۔"

کچھ ہی دنوں بعد زبردست برف باری ہوئی، تین دن تک لگاتار کہ کوئی اپنے گھر سے نکل نہ سکا۔ اسکول کالج میں چھٹیاں ہو گئیں۔ بلال بھی گھر میں ہی رہا۔ مینو نے کئی بار کوشش کی کہ وہ بلال کے ساتھ اس گرتی ہوئی برف میں نکل پڑے مگر وہ کام کا بہانہ کرتا یا کہتا بیمار پڑنا ہے کیا اور وہ چپ بیٹھ جاتی۔ تیسرے دن بہت خوشنما دھوپ نکلی۔ ساری خلقت باہر نکل آئی بچّے برف پر کھیل رہے تھے، لوگوں کے پالتو کتّے سڑک پر قلانچے بھر رہے تھے۔ مینو کھڑکی میں کھڑی محظوظ ہو رہی تھی تب ہی اس نے اپنے پڑوس کے فلیٹ میں سامان اترتے دیکھا۔ اسی وقت اوپر سے اندو آئی۔

"اس کمرے میں کوئی آ گیا ہے کیا؟

"ہاں۔۔ دیدی ایک فوٹو گرافر نے ایک مہینے کے لیے یہ کمرہ کرائے پر لیا ہے۔ برف باری میں ہر سال لوگ اس طرح آتے ہیں کچھ دنوں کے لیے۔"

آج نیچے ویلی میں چلنا ہے؟۔“ اس نے مینو سے پوچھا

”ہاں میں تمھیں بلانے ہی والی تھی پانچ منٹ دو میں تیار ہو جاؤں۔“

اس نے بلال کو بتا دیا کہ وہ اندو کے ساتھ جا رہی ہے اور اپنا پیارا سا سرخ فراک پہن کر اوپر سے اوور کوٹ پہن لیا۔

”دیدی ہیٹ یا چھتری بھی لے لو کہیں برف نہ گرنے لگے۔“

”دونوں تیار ہو کر ہرن کی طرح قلانچیں بھرتی وادی میں اتریں۔۔ آج مینو قدرت کی صنّاعی اور خوبصورتی سے اتنی خوش تھی کہ اندو سے بھی زیادہ چھوٹی بچّی لگ رہی تھی۔ وادی میں ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے اچانک پھر سے برف باری شروع ہو گئی۔“ دیدی واپس چلیں

کہیں تیز نہ ہو جائے''۔مینو نے اپنا اوور کوٹ اتار دیا اور فراک پھیلا پھیلا کر ناچتے ہوئے بولی بس کچھ دیر اور رکو۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی وھرلنگ درویش کی طرح وجد میں آ گئی ہو۔اس کی سرخوشی دیکھ کر اندو بھی ششدر رہ گئی ''آپ کو برف باری اتنی پسند ہے دیدی۔''

"میں نے پہلے کبھی ایسا خوبصورت منظر نہیں دیکھا۔''۔اس نے پھوار کی طرح گرتے ہوئے برف میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر کیے اور ناچتی رہی۔پھر بولی۔" بس ایک ہی کمی ہے،کوئی سرخ گلاب پیش کرنے والا موجود نہیں۔"

"اس برفیلے منظر میں۔آپ خود کسی سرخ گلاب سے کم ہو کیا۔"۔اندو نے کھل کھلا کر کہا۔

اچانک دونوں چونک کر ڈر گئیں۔۔ایک روشنی سی چمکی تھی اور کئی بار چمکی تھی۔شروع میں تو انہیں اپنا وہم لگا،مگر پھر یقین ہو گیا کہ ان کے علاوہ یہاں پر کچھ تو ہے،اس نے پہاڑی ریچھ کے قصّے سن رکھے تھے، پلم کے گھنے پتوں کے پیچھے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر اس گہری وادی کے سنّاٹے میں دونوں کو بری طرح ڈر لگا۔مینو نے جلدی سے کوٹ پہنا۔۔بال پر سے برف جھاڑی اور ہیٹ لگا کر تیزی سے اندو کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف بھاگی۔دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کریں گی تا کہ ان کے اس طرح نکلنے پر کوئی پابندی عائد نہ ہو جائے۔گھر پہنچ کر جلد ہی مینو اس واقعے کو بھول گئی۔

اندو سے ہی اسے معلوم ہوتا رہتا کہ پڑوس میں جو لڑکا آیا ہے اس کا نام ورون ہے۔یا یہ کہ وہ ایک انٹرنیشنل فوٹو گرافی کمپٹیشن میں حصہ لینے والا ہے اور پہاڑی علاقے کی کچھ تصویریں لینے آیا ہے۔ ایک صبح مینو کپڑے دھو کر باہر پھیلا رہی تھی کہ اس کی نظر پاس والے بر آمدے کی طرف اٹھ گئی۔وہ لڑکا بڑی محویت سے مینو کو دیکھے جا رہا تھا۔۔اس کی نظر میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ مینو کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اور وہ گھبرا کر اندر چلی گئی۔کچھ دیر اسے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں لگا پھر اس نے لاحول پڑھا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ کہیں آتے جاتے ہوئے، برآمدے میں پڑھتے وقت،کام کرتے وقت یعنی ہر وقت وہ ان نگاہوں کی گرمی کو محسوس کر رہی ہے۔کہیں نا کہیں سے وہ نظریں اس کا پیچھا کرتی رہتی تھیں۔ایک آدھ بار تو اسے لگا کہ وہ اسے مخاطب کرنا چاہتا ہے۔وہ ڈر کر چھپ جاتی پھر اسے غصہ آنے لگا،اس نے برآمدے میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔اس کے گھر میں رہنے تک وہ باہر ہی نہ نکلتی۔ادھر ادھر اتفاقیہ ملاقات پر کئی بار اس نے دوستانہ مسکراہٹ بھی دی مگر مینو نے صاف اگنور کر دیا۔پھر وہ کچھ دن تک نظر نہ آیا تو اس نے سکھ کی سانس لی،مگر جلد ہی اسے شدّت سے احساس ہوا کہ ان پیچھا کرتی نظروں نے اس کا سکون چھین لیا ہے۔وہ ان نظروں کی کمی محسوس کر رہی تھی اس نے دل میں اعتراف کیا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ ایسا ہی تھا۔اس حقیقت کا اعتراف دل میں کرتے ہی وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔وہ جتنا اس بات کو دل دماغ سے نکالتی اسے یہ حقیقت اتنا ہی ڈراتی کہ وہ بلال سے دغا کر رہی ہے۔وہ تنہا ہوتی تو بستر میں لیٹ کر سر رضائی کے اندر کر کے دیر تک روتی۔اور حیران ہو کر سوچتی اچانک اسے یہ کیا ہو گیا ہے،کل تک تو وہ خوش تھی،اسے احساس ہوا زندگی اور اس سے جڑی خوشیوں سے زیادہ غیر یقینی چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں وہ جسے اپنی سب سے بڑی خوشی سمجھنے کی کوشش میں تھی وہ اچانک کیسی بے معنی اور بے وقعت ہو گئی ہے۔اس نے بھی تو پورے خلوص،پورے جوش سے نئی زندگی کو اپنا لیا تھا کیوں کہ اس کا آئیڈیل تو صرف ایک خیال تھا۔۔مگر خدا کو کیا ضرورت تھی کہ اس خیال کو اس طرح حقیقت بنا کر اس کے سامنے لے آیا وہ بھی اب اور اس طرح۔نہ وہ ہم مذہب تھے نہ ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے کا کوئی موقع تھا۔مگر اس کا دل اس سے محبت کرنے پر مصر تھا۔اس کے اس دکھ میں کتنا بے تکا پن ہے۔دکھ کے ساتھ اسے ایک شرمندگی نے گھیر لیا۔

بلال اس کی حالت،اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر فکرمند ہو جاتا۔تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے وہ پیشانی چھو کر دیکھتا۔تمھیں بخار ہے وہ کہتا۔وہ کہتی میں ٹھیک ہوں۔مگر اسے سچ مچ ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔اندو نے بلال کو بتایا کہ وہ برف میں بہت دیر رہی تھی اسی کا اثر ہو گیا ہوگا۔ڈاکٹر نے دیکھ کر نمونیہ تشخیص کیا اور ایڈمٹ کر لیا۔بلال روز اس کے لیے پھل جوس لے کر آتا۔اس کے ساتھ رہتا،اس کے بالوں کو سہلاتا۔اور اس کے سرہانے بیٹھتا۔اور اس کا التفات پا کر مینو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔اسے سمجھ نہ آتا کہ اسے بلال سے بے

وفائی کا غم ہے یا اپنی اس بے تکی محبت کا صدمہ۔
"رونا نہیں تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' بلال پیار سے جھک کر کہتا۔ اور وہ دھیرے سے کہتی۔
" آئی ایم سوری بلال"۔اسے بھابھی کی بات یاد آتی۔کوئی شوہر ویسا نہیں ہوتا پر دونوں میں محبت بہت ہوتی ہے۔
"سوری کیوں، برف باری میں گھومنے پر؟ میں نے اسی لیے منع کیا تھا نا۔خیر کوئی بات نہیں،کبھی میں بیمار پڑوں گا تو تم ایسے ہی میرا خیال رکھنا۔'' بلال مسکرا کر کہتا۔

''لکھا تھا... ''جب بھی آپ لوگوں سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش کی موقع نہیں ملا۔اپنی ایک گستاخی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی وائف بہت فوٹو جنک ہیں۔ جس دن آیا تھا۔۔ وادی میں ان کی چھپ کر تصویر لی تھی تب نہیں جانتا تھا یہ ہماری پڑوسی ہیں۔ بعد میں انہیں بتانا چاہتا تھا مگر انھوں نے کبھی بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔آج جاتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔پر آج بھی آپ لوگ نہیں ملے۔ان کی اسی تصویر نے کمپیٹشن میں فرسٹ پرائز دلوا دیا۔ میرا سبجکٹ تھا۔''سرخ گلاب''

پندرہ دن بعد مینو کا بخار اتر گیا، بلال کی اتنی توجہ پا کر دل بھی خوش اور مطمئن ہو چلا تھا،اس کی طبیعت بحال ہوئی تو ہاسپٹل سے ڈسچارج مل گیا۔
دونوں گھر پہنچے تو برآمدے کے ٹیبل پر ایک خط،ایک سرخ گلاب اور ایک گفٹ پیک پڑا ہوا تھا۔
مینو کا دل دھک سے ہو گیا۔بلال نے خط الٹ پلٹ کر دیکھا اور پڑھنے لگا۔
لکھا تھا۔۔۔''جب بھی آپ لوگوں سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش کی موقع نہیں ملا۔اپنی ایک گستاخی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔آپ کی وائف بہت فوٹو جنک ہیں۔جس دن آیا تھا۔۔وادی میں ان کی چھپ کر تصویر لی تھی تب نہیں جانتا تھا یہ ہماری پڑوسی ہیں۔ بعد میں انھیں بتانا چاہتا تھا مگر انھوں نے کبھی بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔آج جاتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔پر آج بھی آپ لوگ نہیں ملے۔ان کی اسی تصویر نے کمپیٹشن میں فرسٹ پرائز دلوا دیا۔میرا سبجکٹ تھا۔''سرخ گلاب''
اور مجھے وادی میں ایسا یونیک سرخ گلاب نظر آیا تھا کہ میں تصویر لینے پر مجبور ہو گیا۔اس لیے آج یہ ایک سرخ گلاب ان کے شکریے کے
لیے خاص طور پر لایا تھا۔ اور دوسرا پیکٹ سرصرف آپ کے لیے ہے،اسے آپ ہی کھولیے۔کیونکہ اس میں بھی ایک ایسا سرخ گلاب ہے جس پر صرف آپ کا حق ہے۔
بلال نے پیکٹ کھولا۔۔۔مینو کی تصویر تھی برف پوش پہاڑوں کے درمیان سرخ فراک میں کسی وھرلنگ درویش کی طرح وجد میں ناچتی ہوئی۔
بلال کے منہ سے بے ساختہ واہ نکلا۔۔اس نے کہا واقعی میرا سرخ گلاب تو سب سے مختلف ہے اور میں سمجھ گیا ہوں کہ اسے مجھے بہت سنبھال کر رکھنا ہے کہ یہ بہت جلد مرجھا جاتا ہے۔چلو اندر چلیں۔
"ارے ہاں یہ شکریے والا گلاب تم رکھو یہ تمھارے لیے ہے۔تمھیں تو پھول ویسے بھی بہت پسند ہیں"۔
مینو نے ہاتھ بڑھا کر گلاب پکڑ لیا اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو۔

Nastaran Ahsan Fatihi
M/43,2nd floor.
Near Shan e ilahi masjid
Hari kothi Road, Abul Fazal Enclave
New Delhi-110025

رینو بہل

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے ہیں...

اُس روز اچانک تقریباً چالیس سال بعد اُسے سامنے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں شمشان گھاٹ سے روی کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر نکل ہی رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے مجھے نام لے کر پکارا۔ پلٹ کر دیکھا تو آدیت کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک مدت بعد اچانک اُسے سامنے دیکھ کر میرا اُداس چہرہ بھی کِھل اُٹھا۔ دراصل روی، آدیت، پلوی اور میرا بچپن اور جوانی ایک ہی محلے میں ایک ساتھ گزرے ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ہم کئی برسوں بعد مِل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کے لیے وقت تھم سا گیا ہے۔ بڑھتی عمر اس کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ آگے کے دو دانت ضرور غائب ہو چکے تھے اور بالوں کا رنگ خضاب کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی سیاہ دِکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُمڑی چمک کا راز میں بخوبی جانتی تھی۔ بہت سے سوال اُس کی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ماضی کے سائے اب بھی اُس کے وجود سے لپٹے ہوئے ہیں۔ نہ ہی وہ جگہ بات چیت کے لیے مناسب تھی اور نہ ہی ماحول۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کے بعد زندگی کے موجودہ حالات پر سرسری باتیں ہوئیں۔ ایک دوسرے کو اپنا فون نمبر دے کر رابطے میں رہنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

وقت کی گرد میں چہرے دھندھلا ضرور جاتے ہیں، مگر وہ اپنی شناخت اور اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ آدیت کا وجود بھی وقت کی آندھی میں کہیں کھو گیا تھا اور اچانک سامنے دیکھ گزرا ہوا وقت لمحہ زندہ ہو گیا۔ آج پلٹ کر اُس وقت کے بارے میں سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں یکساں تھیں۔ ہم دونوں جذباتی تھے، دِل کی گہرائیوں سے محبت کرنے والے، اندھا اعتماد کرنے والے اور جاں نثار کرنے کو بے تاب۔ ہم دونوں نے انہیں کمزوریوں کی وجہ سے چوٹ بھی کھائی، صدمہ بھی سہا اور وہ بھی ایک ہی شخص کے ہاتھوں۔ وقت کے ساتھ گہرے زخم بھی بھر جاتے ہیں مگر اُن کے نشان تاعمر سبق بن کر یاد رہ جاتے ہیں۔

مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میری اور پلّوی کی دوستی کب اور کیسے ہوئی۔ شاید جب سے ہوش سنبھالا تب سے ہی ہم ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے ایک ساتھ کھیلتے کودتے، لڑتے جھگڑتے بچپن کا وہ حسین دور ایک ساتھ گزارا۔ اُس وقت ہر چیز خوبصورت لگتی تھی۔ ہر رنگ اچھا لگتا تھا۔ موج تھی، مستی تھی، کوئی فکر نہ کوئی فاقہ۔ تتلیوں کی مانند اُڑتی پھرتی، پرندوں کی طرح چہکتی، بے بات ہی کھلکھلا کر ہنستی رہتی تھیں۔

گہری دوستی کے باوجود ہم دونوں کے مزاج اور دلچسپیوں میں فرق تھا۔ وہ سائنس کی اور میں آرٹس کی طالب علم تھی۔ وہ ہمیشہ اوّل درجے میں پاس ہوتی۔ میں کھینچ تان کر ہی اوّل درجے کی دہلیز تک پہنچتی۔ سائنس اور ریاضی اُس کے محبوب موضوع تھے اور مجھے ان دونوں کے بارے سوچ کر کوفت ہوتی مجھے ادب، موسیقی، اور مصوری میں دلچسپی تھی۔ وہ دماغ سے سوچتی تھی اور میں دل سے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہماری آنکھوں میں رنگین

چلاتے ہوئے۔یہ شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں،فلم اور سیریل دیکھ کر تیرا تو دماغ ہی چل گیا ہے۔"

"بھابھی۔۔کیا اصلی زندگی میں ویسے لوگ نہیں ہوتے۔"

" کیا پتہ؟ ہوتے ہوں گے۔۔مگر یہ تو پکّی بات ہے کہ کوئی شوہر ایسا فلمی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی بیویاں باغ میں دوڑ دوڑ کر گانا گاتی ہوئی۔سمجھی! خیالوں کی دنیا سے نکل آؤ۔"انھوں نے قہقہہ لگایا۔

"پیار کے بغیر دو لوگ شادی کیسے کرسکتے ہیں؟۔"

"یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے رکھتے دونوں میں پیار ہوجاتا ہے۔"

ان ہی خدشات اور نصیحتوں کے ساتھ وہ بیاہ کر بلال کے ساتھ نئے شہر میں آگئی۔کوئی کمی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے لگتا کہ کسی نے اسے اس کے سہانے سپنوں کے درمیان سے اغوا کرلیا ہے۔پھر بھی وہ شوہر کے مزاج کو سمجھنے اور اس نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتی۔بلال کو بہت کم بات کرنے کی عادت تھی،مگر اپنے تئیں وہ اس کا پورا خیال رکھتا۔بس مینو کو غصہ تب آتا جب وہ کبھی اس کے ساتھ کہیں جانے کے لیے اپنا کوئی بھڑکیلا لباس زیب تن کرتی یا کوئی فراک سوٹ پہنتی تو وہ آنکھیں سکوڑ کر بس اتنا کہتا"ساڑی پہن لو ساڑی میں زیادہ گریس فل لگتی ہو۔"وہ چڑھ جاتی مگر اس کی سنجیدگی دیکھ کر کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوتی۔اسے وہ بال کھلا نہ رکھنے دیتا کہتا جوڑا کرلو کھلے بال میں بچّی سی لگتی ہو۔رفتہ رفتہ اسے بلال کی بات سمجھ میں آتی گئی۔

وہ اس کی طرح سنجیدگی اوڑھ کر رہنے لگی۔بلال نے اسے کتابیں لاکر دیں کہ دن بھر فارغ رہنے سے بہتر ہے پڑھائی کرو،نئے سیشن میں ایڈمیشن کروادوں گا۔یہ بات اسے کچھ کچھ پسند آئی،کم از کم کچھ بننے کا خواب تو وہ اب بھی پورا کرسکتی ہے۔

لیکن سارا سارا دن تنہا اس سے بیٹھا نہ جاتا،وہ چاہتی کہ بلال اسے اچھی اچھی جگہوں کی سیر کرائے،دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے ساتھ چہل قدمی کریں مال روڈ پر گھومیں،آئسکریم کھائیں۔۔مگر بلال کو تو اس کے ساتھ چلنے میں بھی شرم محسوس ہوتی،ارے ہر طرف میرے اسٹوڈنٹ ہیں،اس طرح اچھا نہیں لگتا۔پھر اس نے بلال سے کوئی بھی توقع رکھنا چھوڑ دیا۔تب اندو کی دوستی نے اسے سہارا دیا۔اگر وہ بلال کے ساتھ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگنے کی کوشش کرتی تو اندو کے ساتھ پانچ سال چھوٹی بن جاتی۔۔اس کے ساتھ اس نے اس پہاڑی علاقے کا چپّہ چپّہ چھان مارا۔بلال بھی مطمئن تھے کہ اندو جیسی بے ضرر لڑکی اس کی بیوی کا دل بہلائے رکھتی ہے۔کبھی جھرنا،کبھی ندی،کبھی گھاٹی کی سیر کرتیں دونوں مست رہتیں۔کسی درخت سے پلم اور گلم توڑتیں،کہیں سیب یا اخروٹ سے دوپٹّے بھر لاتیں۔کبھی چیڑ کے درختوں کے پھول جمع کرتیں اور اسے رنگ برنگے پینٹ کرکے سجاتیں۔زندگی ایک سیدھے اور مخصوص ڈگر پر چل پڑی تھی کہ اچانک ندی کے شانت پانی میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی۔

ٹھنڈ میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔اس لیے اب ان دونوں لڑکیوں نے وادی میں گھومنا چھوڑ دیا تھا،سردیوں کے بعد مینو کا ایڈمیشن ہونا تھا اس لیے وہ اکثر اپنی کتابیں پھیلا کر برآمدے کی دھوپ میں بیٹھ جاتی۔کبھی کبھی اندو آجاتی اور شکایت کرتی کہ وہ اب اس کے ساتھ گھومنے نہیں جاتی کم سے کم ہم مال روڈ تک تو جا ہی سکتے ہیں۔برف گرنے دو اندو میں نے کبھی برف باری نہیں دیکھی۔۔برف گرے گی تو مجھے نیچے اس وادی میں لے جانا جہاں سے چاروں طرف صرف پہاڑ اور جھرنے نظر آتے ہیں۔۔''ہاں دیدی،وہاں ضرور چلیں گے بہت پیاری جگہ ہے اور وہ ٹورسٹ پلیس نہیں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا۔"

کچھ ہی دنوں بعد زبردست برف باری ہوئی،تین دن تک لگاتار کہ کوئی اپنے گھر سے نکل نہ سکا۔اسکول کالج میں چھٹّیاں ہوگئیں۔بلال بھی گھر میں ہی رہا۔مینو نے کئی بار کوشش کی کہ وہ بلال کے ساتھ اس گرتی ہوئی برف میں نکل پڑے مگر وہ کام کا بہانہ کرتا یا کہتا بیمار پڑنا ہے کیا اور وہ چپ بیٹھ جاتی۔تیسرے دن بہت خوشنما دھوپ نکلی۔ساری خلقت باہر نکل آئی بچّے برف پر کھیل رہے تھے،لوگوں کے پالتو کتّے سڑک پر قلانچے بھر رہے تھے۔مینو کھڑکی میں کھڑی محظوظ ہورہی تھی تب ہی اس نے اپنے پڑوس کے فلیٹ میں سامان اترتے دیکھا۔اسی وقت اوپر سے اندو آئی۔

پلوی میرے زخموں پر مرہم رکھتی، مجھے تسلّی دیتی رہی اور دوسری طرف وہ خود ہی بے مروّتی سے آدیت کو اذیت دے رہی تھی۔ جب اس کی دال پلوی کے آگے نہ گل سکی تو وہ روتا گڑگڑاتا میرے پاس آیا کہ میں اس کی سفارش پلوی سے کروں۔ اب بھلا محبت میں بھی سفارش چلتی ہے؟ یہ تو دِل کے سودے ہیں۔ محبت کسی سے زبردستی تو نہیں کی جا سکتی؟ اگر کر سکتے تو میں اپنا دل ٹوٹنے سے نہ بچا لیتی؟

پلوی ذہین تھی، محنتی تھی۔ اس کے خواب بھی بڑے تھے۔ اُس کے ارادے بلند تھے۔ وہ کامیابی کی جس بلندی کی طرف گامزن تھی، اس راستے میں آدیت کا نام ونشان نظر نہیں آتا تھا مجھے۔ زخمی پرندے کی طرح وہ پھڑ پھڑاتا رہا۔ اس سے ملنے کے راستے تلاشتا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جسے اُسے دیکھے بنا قرار نہ آتا تھا وہ اچانک کیسے بدل گئی۔ جس نے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے وہ اچانک راستہ کیسے بدل سکتی ہے؟ دل میں بسنے والا بے وجہ ہی دل سے کیسے اتر گیا؟ اب تک میں سمجھ چکی تھی کہ پلوی کی نظروں میں آدیت ایک معمولی سرکاری ملازم تھا اور وہ اپنے سے کم پڑھے لکھے کم حیثیت والے شخص کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وقت نے اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جن لوگوں کے مقصد بڑے ہوتے ہیں، جن کے خواب بلندیوں کو چھونے کے ہوتے ہیں وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو روندھتے کچلتے منزل تک پہنچنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ آدیت اس کے راستے کی رکاوٹ تھی جسے اس نے بنا کچھ کہے خاموشی سے اپنے قدم پیچھے کھینچ کر ہٹا دیا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے کا سارا ملبہ اس نے اپنے بھائیوں کے سر ڈال دیا۔ اپنے ٹوٹے دل اور خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے میں نہ جانے آدیت نے کتنی راتیں، کتنے مہینے، کتنے سال لگا دیے۔ کانٹوں کی چبھن کا احساس اس کے چہرے پر لکھا تھا جسے دیکھ کر میرا دل پسیج اٹھتا۔ پلوی کو اب آدیت کا ذکر سننا بھی گوارا نہ تھا۔ وہ صرف آگے دیکھنا چاہتی تھی پیچھے پلٹ کر دیکھنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔

آدیت نے اپنا تبادلہ کہیں دور دراز علاقے میں کروا لیا۔ پلوی نے راحت کی سانس لی۔ زندگی کی اس رفتار میں سب اپنی اپنی منزلوں کی تلاش میں جدوجہد کرتے رہے۔ میں نے تعلیم مکمل کر کے ملازمت شروع کر لی اور پلوی نے یونیورسٹی میں ہی فزکس میں پی ایچ۔ ڈی شروع کر دی۔ اس کا زیادہ تر وقت کتابوں اور میرے ساتھ ہی گزرتا۔ بھائیوں کی شادی ہو جانے کی وجہ سے اس کے گھر کا ماحول بدل گیا تھا۔ جب اسے اپنے گھر میں پڑھائی کا ماحول نہ ملتا تو وہ ہمارے یہاں آجاتی۔ ہماری غیر موجودگی میں بھی وہ ہمارے کمرے میں پڑھتی رہتی۔ میرے والدین اس کی پڑھائی کی ایسی لگن سے بے حد متاثر تھے۔ میری ماں وقفے وقفے پر جا کر کبھی چائے کبھی ناشتہ بنا کر اُسے دے آتی۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں ہر دم اُس کے ہر کام کے لیے بے قرار رہتی۔ وہ ان کے لیے رول ماڈل تھی۔ جب کبھی بھی ریسرچ کے سلسلے میں پلوی کو شہر سے باہر جانا ہوتا تو میں دفتر سے چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔ میرے والدین نے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری تین نہیں چار بیٹیاں ہیں۔ یہ ہی پیار اور خلوص اس کے گھر والوں کے دلوں میں ہم سب کے لیے بھی تھا۔

میرے گھر میں میرے لیے مناسب رشتے کی تلاش زور شور سے چل رہی تھی۔ آئے دن نمائش کا سلسلہ نکل آتا۔ کبھی میں کسی کو پسند نہ آتی تو کبھی کوئی مجھے پسند نہ آتا۔ جانے انجانے میں اپنے ہونے والے شوہر میں شاید میں چترنجن کو تلاش کر رہی تھی۔ پہلی محبت لہو بن کر تا عمر شریانوں میں مچلتی رہتی ہے۔

ایک روز میرے ساتھ کام کرنے والے نوین نے جس کے ساتھ میں کافی بے تکلف تھی، دفتر میں ہی سب کے سامنے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے سے جانتے تھے، ہماری دلچسپیاں یکساں تھیں۔ کتابوں، فلموں، شاعری پر ہماری اکثر گفتگوں ہوتی رہتی۔ میں اسے اپنا اچھا دوست سمجھتی تھی، مگر اس طرح وہ شادی کا سب کے سامنے اظہار کر دے گا کبھی سوچا نہ تھا۔ اس کی بات سن کر پہلے تو میں سٹپٹا گئی۔ پھر شرم سے نظریں جھک گئیں۔ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ میرے اُٹھتے ہی کچھ پل پہلے جو خاموشی چھا گئی تھی وہ قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اُس دن دفتر میں سب کی زباں پر یہی ایک بات رہی۔

اُسی شام نوین اپنے والدین کو لے کر ہمارے گھر پہنچ گیا اور اس کی والدہ نے باقاعدہ ضد کر کے رشتہ پکا کروا لیا۔ ایک دو مرتبہ وہ

پہلے ہمارے گھر آ چکا تھا سب اس سے اچھے سے واقف تھے۔ ماں پاپا نے میری مرضی پوچھی تو میں نے حامی بھر دی۔ پلوی اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں تھی۔

مجھے وہ بار بار کہتی رہی، ''تم نے ہاں کرنے میں جلدی کر دی۔''

''نوین تمہیں پسند نہیں؟ کیا کمی نظر آئی تمہیں؟''

''وہ ایک اچھا لڑکا ہے مگر تم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہو۔''

جو بات وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی ، وہ میں بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اب تک میں جان چکی تھی کہ وہ نام و نمود کی پرستار ہے۔ احساسِ برتری کا اضافہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہو رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے ملازمین کو وہ کم تر سمجھتی ہے۔ خیر، دنیا کے ساتھ اس کا رویہ کیسا بھی ہو، میرے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

ڈاکٹریٹ مکمل ہوتے ہی اسے یونیورسٹی میں ہی پروفیسر کی ملازمت مل گئی۔ میری اور نوین کی شادی کے دو ماہ بعد ہی یونیورسٹی کے ایک ذہین اور قابل پروفیسر کا اس کے لیے رشتہ آ گیا جو بڑی خوش اخلاقی سے قبول کر لیا گیا۔ ڈاکٹر دت خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں اُس نے سب کا دل جیت لیا۔

شادی کے بعد زندگیوں میں تبدیلی آنا لازمی تھا جس کے بارے میں ہم دونوں شادی سے پہلے بات کر چکی تھیں۔ بے شک ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہو گیا تھا مگر رابطے برقرار تھے۔ آنکھوں سے دور تھے مگر دلوں میں دوریاں نہیں تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کی طرف سے رشتہ میں گرماہٹ کم ہونے لگی ہے۔ اب اس سے مل کر پہلے والی محبت، خوشی، اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا گلہ بھی کیا۔ یہ بھی پوچھا کہ ڈاکٹر دت سے رشتوں میں کشیدگی تو نہیں؟ مگر اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا کہ ڈاکٹر دت اس کا پورا خیال رکھتے ہیں بس زندگی میں مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کام کا بہت بوجھ ہے۔

سال بعد ہی اس نے بیٹی کو جنم دیا اور تیسرے سال میں بیٹے کو۔ جب کہ میری کوکھ سونی رہی۔ اب وہ زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ اب زیادہ تر میں ہی اس کے گھر، اُس سے اور بچوں سے ملنے چلی جاتی۔ اس کے بچوں کے ساتھ کھیل کر خوشی محسوس ہوتی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اُس نے گورنس رکھ لی تھی کیونکہ اکثر اسے کانفرنس اور سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے شہر اور ملک سے باہر جانا پڑتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس قدر وہ کامیابی کشید کرنے میں پرجوش اور بے قرار رہتی ہے۔ ڈاکٹر دت اس کے بالکل برعکس پرسکون اور مطمئن نظر آتے ہیں۔

امید کا ہر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی میری کوکھ ہری نہ ہو سکی۔ مجھ میں ماں بننے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ یہ زمین بنجر تھی اور بنجر ہی رہی۔ میں افسردہ تھی۔ غموں کے ساگر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی دوست پلوی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی مگر وہ دور دور تک مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میری امیدوں کے برخلاف اُس وقت نوین نے مضبوط سہارا بن کر اپنی محبت اور دِن رات میرا خیال رکھ کر مجھے ٹوٹنے سے بچا لیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا پلوی اور میرے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ جیسے ہی میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی زندگی میں میرا وجود بے معنی ہو گیا ہے، میں نے اپنے قدموں کو وہیں روک دیا۔ نہ کوئی گلہ کیا نہ شکایت کیونکہ اب رشتہ اس مرحلے سے بھی گزر چکا تھا۔ ہمارے بچپن کی دوستی خاموشی سے دم توڑ گئی۔ دوستیاں شاید حالات کے ساتھ بدل جاتی ہیں ، ہماری دوستی کا بھی یہی انجام ہوا۔ اب دنیاداری کے لیے کبھی سالگرہ کی مبارک دینے کے لیے اُس کا فون آ جاتا یا پھر میں اس کو بچوں کے جنم دن، اس کی سالگرہ یا پھر کبھی اخبار میں اسے کوئی ایوارڈ ملنے کی خبر پڑھنے پر فون کر دیتی۔ اگر کبھی باہر کسی تقریب میں ملنے کا اتفاق ہو جاتا تو ہم ایسے ہی ملتے جیسے کبھی کوئی دوری ہمارے بیچ آئی نہ ہو۔

شروع شروع میں اس کے بدلتے رویّے سے تکلیف تو بہت ہوئی تھی۔ اپنے دُکھ کو میں نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ نوین کو بھی اس

کی بھنک تک نہ لگنے دی۔ پہلے چتر نجن اور پھر پلوی کا بدل جانا، مجھے اندر تک توڑ گیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا کہ مجرم میں ہی ہوں مجھ میں ہی کچھ کمی ہے جو میری محبت اور وفا کا صلہ مجھے بے رخی اور بے وفائی سے مل رہا ہے۔ ٹھکرائے جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے، وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گزرتی ہے۔ پہلے جس قدر میں پریشان ہوتی تھی اب نہیں ہوتی۔ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ اب مجھے اس کی بے وفائی پر دُکھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی بڑھ کر میری زندگی میں اور مسائل آ کھڑے ہوئے ہیں۔ نوین کی اچانک وفات نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ یہ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ لگتا تھا کہ میں اندھیری کھائی میں اوندھے منھ گر پڑی ہوں اور وہاں سے باہر نکلنے کی نہ مجھ میں قوت ہے اور نہ ہی خواہش۔ نوین مجھے بھری دنیا میں تنہا کر گئے۔ میرے جینے کا اب کوئی مقصد ہی نہیں بچا۔

میرے سسرال اور مائیکے والوں نے اس وقت مجھے سنبھال لیا۔ پلوی اور ڈاکٹر دت بھی تعزیت کے لیے آئے۔ پلوی میرے گلے لگ کر زار و قطار روتی رہی مجھے حوصلہ دیتی رہی۔ روتے روتے بار بار کہے جا رہی تھی کہ ''اب میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ پہلے ہی مجھے آنے میں بڑی تاخیر ہو گئی۔''

میں خاموشی سے سنتی رہی۔ دل میں ہلکی سی ایک امید جاگی کہ شاید میرے ایسے کڑے وقت میں وہ مجھے سنبھال لے گی۔ میرے دکھ میں شریک ہو کر کچھ حد تک میرے اندر اس تکلیف کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر دے گی مگر وہ میری بھول تھی۔ نہ کچھ ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ گنگا گئی ہڈیاں بھی کبھی واپس آتی ہیں۔ جس وقت سب سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت تھی، وہ وعدہ کر کے بھی میرے پاس نہیں آئی۔

گزرتے وقت کے ساتھ مجھے بھی صبر آ گیا۔ مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے؟ یہ بات الگ ہے کہ جانے والے کے ساتھ جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ کوئی پُر نہیں کر سکتا۔ وقت گزر جاتا ہے اور یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ چھوٹی بہنوں کی طرح میری دیورانی میرا خیال رکھتی ہے۔ اس کے دو جوان بچے ''بڑی ماں بڑی ماں'' کہہ کر لاڈ لڑاتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو مصروف رکھنے کے لیے اپنے علاقے کے گھروں میں کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ انھیں پاس کے سرکاری اسکول میں داخلہ دلوا دیا ہے۔ پانچ سال کی عمر سے لے کر چودہ سال کی عمر کے آٹھ بچے ہیں۔ اسکول سے سیدھے میرے گھر آتے ہیں۔ ایک ملازمہ صرف اُن کے لیے دوپہر کا کھانا پکانے کے لیے رکھی ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ کھانا کھا کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسکول کا کام کرتے ہیں اور جو سمجھ نہیں آتا، مجھ سے پوچھ لیتے ہیں۔ شام کو ان کی مائیں کام سے لوٹتے وقت انھیں گھر لے جاتی ہیں۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے اور ان کی مائیں بھی بے فکر ہو کر اپنا کام کر لیتی ہیں۔

آج صبح ہی آدیت نے فون کر کے کہا ہے کہ وہ شام کو ملنے آئے گا۔ میں نے کہا بیگم کو بھی ساتھ لے آنا، اِسی بہانے اُس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اس نے سپاٹ سا جواب دیا، ''آج نہیں پھر کبھی ملواؤں گا۔ آج مجھے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

جانتی ہوں وہ بہت ساری کون سی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ پلوی کے دیے زخم کھرچے گا اور مجھے بھی تکلیف دے گا۔ میں دل سے نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ہماری دوستی کا جو بھرم اُس کے ذہن میں بنا ہے، وہ قائم رہے۔ کس منھ سے اُس سے کہوں گی کہ بھائی جو حادثہ تیرے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس حادثہ سے میں بھی گزری ہوں۔ مجھے اُس وقت سنبھل جانا چاہیے تھا جب تمہیں ٹھوکر لگی تھی۔ کیسے کہوں گی اس سے کہ

جھلیا۔۔۔۔۔۔\
عشق کمانا اوکھا\
کیسے نوں یار بنانا اوکھا\
پیار پیار تے ہر کوئی کو کے\
کر کے پیار نبھانا اوکھا۔

❑❑❑

Renu Behl
#1505 , Pushpac compkex
Sector 49B,
Chandigarh-160047 (Haryana)
E-mail: renubehl06@gmail.com

حفظان صحت
خواتین کے تناظر میں

مہر فاطمہ حسین

خواتین کا کردار سماج کی تشکیل میں فیصلہ کن حیثیت کا حامل ہے۔ نہ صرف وہ درون خانہ اپنا رول ادا کرتی ہیں بلکہ گھر کے باہر بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ اور بعض دفعہ ان سے بھی بہتر انداز میں، اپنی ذمے داریاں نبھاتی ہیں۔ ایسے میں ان کی صحت بھی کئی اعتبار سے متاثر ہوتی ہے، جو خصوصی توجہ اور انتظامات کی متقاضی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ طبقۂ نسواں کے مسائل یکساں نہیں ہیں۔ ہماری اجتماعی زندگی میں خواتین کے کردار کے متعدد ارتقائی ادوار رہے ہیں۔ آج بھی ہمارا سماج اپنی روایتی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خواتین کو کمتر سمجھتا ہے اور ان پر اسقاط حمل جیسے مختلف مظالم روا رکھے جاتے ہیں۔ معاشرے میں آج بھی بچیاں پیدا ہونے سے پہلے موت کی نیند سلا دی جاتی ہیں۔ مادہ جنین کا قتل انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہے جس میں ایک بچی کو اس کے جینے کے بنیادی حق سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے۔

خواتین کے خلاف مظالم کی روک تھام اور ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مختلف حکومتوں کی جانب سے کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔ ہندوستان میں بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ کے تحت حکومت، سماج میں بیٹیوں کی زندگی اور ان کی بہتر تعلیم پر زور دیتی ہے۔ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھنے والی بچیوں کے لیے اسی طرز پر سبلا اسکیم بھی ہے اس کا مقصد 11 سے 18 سال کی لڑکیوں کی تعلیم، تغذیہ اور صحت کی صورت حال کو بہتر بنانا ہے۔ ایک معاشرے کی ترقی اس کے تمام طبقات کے درمیان مساوات سے مشروط ہے۔ یہ مساوات ہماری اسکیم اور پالیسی کا جز و لازم ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماحول کی سازگاری بھی طبقۂ نسواں کے جائز حقوق کے حصول میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر خواتین اپنے حقوق کی حفاظت سے قاصر ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ پورا معاشرہ ترقی سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان حقوق میں معیاری صحت کا حق بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عورت کی زندگی کے مختلف ادوار متعدد مزاحمتوں سے عبارت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں مروجہ اسکیم اور پالیسیاں خواتین کو تقویت بہم پہنچانے کے قابل ہیں بھی یا نہیں؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ موزوں ہوگا کہ ہندوستان سی ای ڈی اے ڈبلیو اور اقوام متحدہ کی جانب سے متعارف کردہ پائیدار ترقیاتی اہداف (Sustainable Development Goals) کی توثیق کرنے والے ممالک میں شامل ہے، جس کے تحت صنفی مساوات کا حصول لازم ہے۔ اس سے خواتین کی بہتر صحت اور تندرستی کی فراہمی مقصود ہے خواتین کا بہتر تغذ بھی اس قانونی توضیع کی ایک

اہم شق ہے۔خواتین کی زندگی اوران کے رول کے حوالے سے متعدد دوسری اسکیمیں بھی متعارف کرائی گئی ہیں جونافذ العمل بھی ہیں۔

Women's Reproductive Rights ,The Pre-Conception and Pre-Natal Diagnostic Techniques (Prohibition of Sex Selection)Act, 1994 , Aaganwadi Asha, Maternity Relief and Benefits Banning Female infanticide and foeticide

جیسی قانونی پیش قدمیاں خواتین کے تحفظ اور حقوق کے حوالے سے حکومت ہند کی سنجیدگی کی غماز ہیں۔

صحت کے پہلو کے علاوہ ہندوستان اور دیگر جنوبی ایشیائی مما لک میں جہیز کا مسئلہ خواتین کے انسانی حقوق کے ضمن میں ایک بڑی لعنت خیال کیا جاتا ہے، جس نے خواتین کی زندگی کو مشکل بنادیا ہے۔اس وقت ہمارے ملک میں جہیز کے انسداد کا قانون موجود ہے جسے مضبوطی کے ساتھ نافذ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔اس قانون کی تشکیل اوراس کو مزید مؤثر بنانے میں خواتین کی تحریک کا کلیدی رول رہا ہے۔ستی جیسی قبیح رسم کا خاتمہ بھی خواتین کی تحریکوں کا ہی مرہون منت ہے۔کچھ برس پہلے روپ کنور کے ستی ہونے کے اندوہناک واقعے کے بعد ملک میں اس پر نیا قانون متعارف کرایا گیااورخواتین کے اس قبیح رسم کی بھینٹ چڑھنے پر سختی سے پابندی لگا دی گئی۔ستی جیسی سماجی برائیاں اب تک تو تاریخ کا حصہ رہی ہیں لیکن روپ کنور کے واقعے کے بعد اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ تمدنی ارتقا کے مختلف ادوار میں خواتین کی صحت اور زندگی کے ساتھ ہونے والے غیر منصفانہ سلوک ہمارے اجتماعی شعور سے پوری طرح معدوم نہیں ہوئے ہیں۔

متعدد معروف خواتین ہیں جنھوں نے تصنیف وتالیف، تعلیم و تدریس، تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی زندگی کے مسائل کی نمائندگی کے حوالے سے تقسیم ہند کے پس منظر میں خواتین پر پرسوز مظالم کی روداد قلم بند کی ہے۔معروف سماجی کارکن بیگم انیس قدوائی کی 'سوانح حیات' ایک ایسی ہی تحریر ہے جو تقسیم ہند کے وقت خواتین پر ہونے والے مظالم کا پتہ دیتی ہے۔ایسے ناگفتہ بہ حالات میں خواتین کی ذہنی، نفسیاتی اورجسمانی صحت کا خیال رکھنا بہت بڑا چیلنج تھا۔انیس قدوائی، مردلا سارابھائی، کملا بین پٹیل، وجیا لکشمی پنڈت تقسیم ہند کے وقت ہونے والے ان غیر انسانی مظالم کی گواہ بنیں، انھیں قلم بند کیا اوراپنی تحریکی سرگرمیوں سے خواتین کی فلاح اور بہبود کے لیے کوشاں بھی رہیں۔

”صحت نسواں کے ضمن میں راجکماری امرت کور کا ذکر کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے ایمس جیسے ادارے کا ذکر نہ ہو تو تاریخ نا مکمل ہوگی۔ راجکماری امرت کور ہندوستان کی پہلی وزیر صحت رہی ہیں اور ایمس کے قیام میں ان کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ وہ ملک سے متعدد موذی امراض جیسے ملیریا اور ٹی بی کے خاتمے میں سرگرم رہی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ ماضی قریب میں پھیلی کووڈ کی وبا کے دوران اپنے خاندان کے تحفظ میں خواتین دفاع کی پہلی صف میں کھڑی نظر آئیں ۔ اس پر آشوب دور میں انہوں نے اپنے گھر اور رشتہ داروں کا خیال رکھا اور مستعدی سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔“

صحت نسواں کے ضمن میں راجکماری امرت کور کا ذکر کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔اس حوالے سے ایمس جیسے ادارے کا ذکر نہ ہوتو تاریخ نامکمل ہوگی۔راجکماری امرت کورہندوستان کی پہلی وزیر صحت رہی ہیں اورایمس کے قیام میں ان کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔وہ ملک سے متعدد موذی امراض جیسے ملیریا اور ٹی بی کے خاتمے میں سرگرم رہی ہیں۔یہاں ضمنی طور پراس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ ماضی قریب میں پھیلی کووڈ کی وبا کے دوران اپنے خاندان کے تحفظ

میں خواتین دفاع کی پہلی صف میں کھڑی نظر آئیں۔اس پر آشوب دور میں انھوں نے اپنے گھر اور رشتہ داروں کا خیال رکھا اور مستعدی سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔

"خواتین کے لیے صحت کے مختلف زاویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکیم اور پالیسی بنانا بھی وقت کی ایک اہم کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی قبائلی خواتین کی بات کریں تو وہ غربت کے ساتھ غذائیت کی کمی کی لعنت سے بھی دوچار ہیں۔ صاف پانی، حمل، زچگی کے بعد کی نگہ داشت جیسی بنیادی سہولتوں سے وہ یکسر محروم رہ جاتی ہیں۔ ان کی رسائی سرکاری سہولیات تک بھی نہیں ہو پاتی۔ قبائلی معاشرے میں جادو ٹونے کے نام پر مار دینے کے واقعات بھی رپورٹ ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں خواتین پر ناحق تشدد روا رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے تشدد کے انسداد کے لیے قانون تو موجود ہے لیکن اس پر سختی سے عمل کرنا بھی ضروری ہے۔"

سماج میں خواتین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا پھر بھی کچھ ایسی برائیاں نظر آتی ہیں جو خواتین کی عظمت کو مجروح کرتی ہیں۔بہت سی اسکیمیں اس سلسلے میں تشکیل دی گئی ہیں۔انسانی جسم کی خرید و فروخت جنوبی ایشیائی ممالک میں خواتین کے خلاف تیزی سے پھیلتا ہوا ایک سنگین جرم ہے۔اس سے نمٹنے کی غرض سے حکومت کی جانب سے ون اسٹاپ سینٹر کھولا جا رہا ہے۔اس میں تشدد کی شکار خواتین کو ایک چھت کے نیچے متعدد سہولیات دستیاب ہو جاتی ہیں۔عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ صحت، قانون، کاؤنسلنگ اور باز آبادکاری سے جڑے مسائل کی غرض سے خواتین کو مختلف مقامات پر جانا پڑتا ہے جو ان کے لیے خاصا دشوار طلب ہوتا ہے۔ضرورت مند خواتین کے لیے ون اسٹاپ سینٹر ایک مخصوص مقام پر تمام سہولیات مہیا کراتا ہے اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔یہ خواتین کو تقویت دینے کے لیے ایک انتہائی قابل ستائش قدم ہے۔

گھر میں جب تمام افراد کھانا کھا لیتے ہیں تب لڑکی یا عورت کو کھانے کی اجازت ہوتی ہے۔ایسے میں اکثر خواتین مکمل غذائیت سے محروم رہ جاتی ہیں ،جس کے نتیجے میں وہ جسمانی کمزوری اور غذائیت کی کمی کا شکار ہو جاتی ہیں۔بڑھتی عمر اور دوران حمل مکمل اور متناسب غذا خواتین کے لیے اشد ضروری ہوتی ہے لیکن بیشتر اوقات ان تک رسائی خواتین کے لیے ممکن نہیں ہو پاتی۔تغذیہ کا یہ فقدان جسم میں خون کی کمی یا انیمیا کے عارضے کا سبب بنتا ہے۔

مستقبل قریب میں ایک ایسا دور بھی آنے والا ہے جس میں عمر رسیدہ خواتین کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔اپنی زندگی میں سختیاں دیکھنے اور اپنے خاندان کو وقت دینے کے سبب جسمانی طور پر سرگرم رہتی ہیں نیز موجودہ طبی سہولیات کی فراہمی کے نتیجے میں وہ دراز عمر پا رہی ہیں۔ پام راجپوت کی رپورٹ کے مطابق 2050 تک عمر رسیدہ خواتین کی آبادی مردوں کی آبادی سے تجاوز کر جائے گی۔اس لیے ہمیں ان خواتین کی صحت کا خاص خیال رکھنے کی اور پیشگی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے ضرورت ہے۔

خواتین کے لیے صحت کے مختلف زاویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکیم اور پالیسی بنانا بھی وقت کی ایک اہم کی ضرورت ہے۔اگر ہم ہندوستان کی قبائلی خواتین کی بات کریں تو وہ غربت کے ساتھ ساتھ غذائیت کی کمی کی لعنت سے بھی دوچار ہیں۔صاف پانی، حمل، زچگی کے بعد کی نگہ داشت جیسی بنیادی سہولتوں سے وہ یکسر محروم رہ جاتی ہیں۔ان کی رسائی سرکاری سہولیات تک بھی نہیں ہو پاتی۔قبائلی معاشرے میں جادو ٹونے کے نام پر مار دینے کے واقعات بھی رپورٹ ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں خواتین پر ناحق تشدد روا رکھا جاتا ہے۔اس قسم کے تشدد کے انسداد کے لیے قانون تو موجود ہے لیکن اس پر سختی سے عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

گھریلو تشدد سے خواتین کا تحفظ ایکٹ 2005 کو خواتین کے تحفظ کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ قانون وسیع تر تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے کیوں کہ خواتین عام طور پر گھر کے اندر تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ گھر کے ماحول میں تشدد اور دہشت کے اثر سے ان کی نفسیاتی، جسمانی اور جذباتی صحت متاثر ہوتی ہے ۔ مذکورہ قانون خواتین کو اس تشدد سے بچاؤ کا ذریعہ فراہم کرتا ہے جس سے وہ اپنی زندگی بہتر بنا سکتی ہیں۔

ان حالات کے مدنظر خواتین اور بچوں کی بہبود کی وزارت نے اپریل 2015 میں 'سکھی سینٹر' قائم کیا۔ اس کے تحت پورے ملک میں 680 سینٹر کھولے جا چکے ہیں 'سکھی سینٹر' تشدد کی شکار خواتین کو تمام ضروری خدمات فراہم کرتے ہیں جن میں میڈیکل، لیگل اور کاؤنسلنگ کی سہولیات تک ان کی رسائی ان کے گھر سے دو کلومیٹر کے دائرے کے اندر مہیا کرائی جاتی ہے۔

تشدد کی شکار خواتین کے لیے ممبئی سینٹر دلاسا ایک انتہائی کامیاب ماڈل ثابت ہوا ہے۔ یہ سینٹر خواتین کے مسائل کی ماہرانہ تشخیص کے ساتھ ساتھ علاج اور کاؤنسلنگ کی سہولیات بھی مہیا کراتا ہے۔ ان کو یہ سہولیات اسپتال کے ماحول کے اندر دی جاتی ہیں۔ اس سینٹر کے کارکن اور رضا کار نہ صرف علاج میں مدد کرتے ہیں بلکہ گھریلو تشدد کی شکار خواتین کو پہچان کر ان کو مربوط خدمات فراہم بھی کرتے ہیں۔ یہ خدمات خواتین کے اذہان سے برے وقت کی یاد کو مٹانے اور آئندہ کی زندگی بہتر گزارنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ نیشنل فیملی ہیلتھ سروے کے مطابق خواتین گھر کے اندر تشدد کا شکار تو ہوتی ہیں مگر نہ تشدد منظر عام پر آتا ہے اور نہ ہی خواتین اس کا کسی سے تذکرہ کرتی ہیں۔ ایسے میں خواتین کو طبی امداد کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے وہ عام طور پر اسپتال سے رجوع کرتی ہیں۔ وہاں ان کے علاج کے ساتھ ساتھ دلاسا سینٹر گھریلو ناچاقی کے اس مسئلے کو اور گہرائی سے سمجھتے ہیں تاکہ اس طرح کا تشدد خواتین پر بار بار نہ ہو اور وہ سچ بول کر گھریلو تشدد کے مسئلے کو اجاگر کریں۔ اس سے تشدد کو بہتر طریقے سے روکنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ممبئی کے دلاسا ماڈل کے تجربے کو دیگر جگہوں یعنی ہریانہ، گجرات ،میگھالیہ، کیرالا اور گوا میں بھی آزمایا گیا ہے۔

گھریلو تشدد کی شکار خواتین کو نہ صرف طبی اور قانونی بلکہ نفسیاتی تدارک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کسی بھی اسکیم کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ نہ صرف اسکیم کا اطلاق ہو بلکہ اس کے درست اطلاق اور نفاذ کے لیے بہتر ماڈل کی بھی تشکیل ہو۔ ایک ایسے ماڈل کی جس پر خواتین بھروسہ کر سکیں۔ اس طرح سماج کی بہتر تشکیل اور خواتین کی بہتر زندگی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

مرکزی حکومت کی وزارت صحت اور خاندانی بہبود نے متعدد اسکیمیں متعارف کرائی ہیں جو خواتین کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے مختص ہیں جن میں نمایاں نام آیوشمان بھارت کا ہے۔ یہ اسکیم فروری 2016 میں آئی اور 2022 تک اس کو نافذ کرنا تھا ۔ 2023 تک ہندوستان میں اس اسکیم کے تحت 160816 سینٹر کام کر رہے ہیں ۔ اس کے تحت صحت میلے منعقد ہوتے ہیں جو خود میں ایک ون اسٹاپ پلیٹ فارم کا ماڈل ہیں۔ یہاں پر صحت کے مسائل کو اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ اسکیم عام لوگوں تک پہنچائی جائے اور عوام بیدار ہو سکیں۔

ان سب کے علاوہ سرکار نے کچھ ایسی اسکیمیں بھی لانچ کی ہیں جو صرف حاملہ خواتین کے لیے مخصوص ہیں جیسے سرکشت ماترتو آشواسن جسے سومن اسکیم بھی کہتے ہیں جس میں زچگی اور نوزائیدہ بچے کے حفظان صحت سے متعلق خدمات فراہم کی جاتی ہیں اور ایسے تحفظاتی اقدام کیے جاتے ہیں جن سے زچہ اور بچہ کو اموات سے بچایا جا سکے۔ اس کے علاوہ جننی سرکشا یوجنا بھی ہے جس میں ادارہ جاتی زچگی کے لیے مالی معاونت دی جاتی ہے۔ جننی شیشو سرکشا کاریہ کرم حاملہ خواتین کو مفت ڈیلیوری کی سہولت عطا کرنے کے لیے ہے۔ اس اسکیم میں خواتین کو سیزیرین آپریشن، آمد و رفت کی مفت سہولت ، مفت تشخیص، خون کی فراہمی اور بہترین غذا فراہم کی جاتی ہے۔

پردھان منتری سورکشا ماترتو ابھیان حاملہ خواتین کو ہر مہینے کی 9 تاریخ کو ایک میڈیکل آفیسر کی نگرانی میں مفت چیک اپ فراہم کرنے میں مددگار ہے۔ اسی طرح موبائل کے ذریعے استعمال میں لانے والا کلکاری پروجکٹ بھی حکومت نے شروع کیا ہے ۔ اسے ڈیجیٹل انڈیا کے تحت 15 جنوری 2016 میں متعارف کرایا گیا تھا۔

اسی طرح لکشمی اسکیم حاملہ خواتین کو بچے کی پیدائش کے دوران لیبر روم اور آپریشن تھیٹر میں اور پیدائش کے بعد ماں کو بہتر طبی نگہ داشت کے لیے متعارف کرایا گیا تھا۔ ان میں اس بات کی بھی گنجائش موجود ہے کہ دور دراز اور قبائلی علاقہ جات میں یہ اسکیم نافذ العمل ہو سکے اور اطلاعات فراہم کرائی جا سکیں۔

"آشا اسکیم ، جو 2005 میں شروع کی گئی تھی ، ملک کے دور دراز علاقے میں صحت عامہ کو بھتر بنانے کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ھے۔ آشا کارکنان صحت عامہ کے روایتی ڈھانچے اور دیھاتی آبادی میں موجود خلا کو پر کرتی ھیں ۔ آشا کارکنان پرائمری ھیلتھ سروس میں کام کر رھی ھوتی ھیں جس کی وجہ سے ان کا دائرہ کافی وسیع ھوتا ھے۔"

آشا اسکیم ، جو 2005 میں شروع کی گئی تھی، ملک کے دور دراز علاقے میں صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آشا کارکنان صحت عامہ کے روایتی ڈھانچے اور دیہاتی آبادی میں موجود خلا کو پر کرتی ہیں۔ آشا کارکنان پرائمری ہیلتھ سروس میں کام کر رہی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ آشا کارکنان زچہ اور بچہ کی صحت کی بہتری کے ساتھ ساتھ بیماریوں کی نگہ داشت اور صحت کی تعلیم کے فروغ کے لیے بھی مامور ہوتی ہیں۔ آشا کارکنان مقامی ضروریات اور چیلینجز کو بہتر طور پر سمجھتی ہیں اور اس کے موثر تدارک کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں۔

علاقائی اعداد وشمار کو جمع کرنے، علاقائی مسائل سے آگاہی اور صحت کے حوالے سے ان کے تجربات انھیں ایک بہتر کردار ادا کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ زبان کے اشتراک کے باعث آشا کارکنان مقامی افراد کے جذبات اور احساسات کی بہتر طور پر ترجمانی کر پاتی ہیں۔ ان کی ان خصوصیات کی وجہ سے ان پر اعتماد بھی کیا جاتا ہے۔

پائیدار ترقی کے اہداف کے مطابق زچگی کی شرح اموات کو سال 2030 تک 70 فی لاکھ تک لے جانا ہے۔ یونیسیف کی ایک تحقیق کہتی ہے کہ 2018۔2020 میں ہندوستان میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق یہ شرح کم ہو کر 97 فی لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یونیسیف ہندوستان کی اس پالیسی کا بھی حامی ہے جس میں ہر زچگی کو ایک پیشہ وارانہ ہنر کا حامل ہیلتھ کیئر فراہم کنندہ کے ذریعے انجام پذیر ہونا یقینی بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماں کی صحت کا بھرپور دھیان رکھنا، حکومتی اسکیموں کا صحیح طریقے سے نفاذ، ان کی عوام میں آگہی اور ان کی رسائی ممکن بنانا بھی اس اسکیم کا جزو لازم ہے تاکہ ان کے فائدے ہر گھر ہر گلی، ہر شہر اور ہر قصبے تک پہنچ سکیں۔ خواتین کی صحت بہتر ہو سکے، خواتین کے خلاف ہونے والے تشدد کے واقعات پر روک لگ سکے، اور یہ تشدد مخفی نہ رہ جائے۔ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے ہمیں مل کر کام کرنا پڑے گا۔ خواتین پر ہونے والے نفسیاتی اور جسمانی تشدد سماج کو پسماندگی کی طرف لے جاتے ہیں جس کے لازمی نتیجے میں عدم مساوات اور ناانصافی پھیلتی ہے۔ خواتین سماج کا ایک مضبوط ستون ہیں اور اس ستون کی صحت کا اثر مجموعی طور پر معاشرے پر ہوتا ہے۔ اس بات کا ہمیں خاص دھیان رکھنا ہوگا کہ خواتین کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر مرحلے سے تشدد کے جملہ واقعات اور تعصب کا مکمل خاتمہ ہو سکے اور وہ ایک بہتر زندگی کی حقدار بن سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں بحیثیت ایک ذمے دار شہری اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں مرتب ہونے والی ہر اسکیم، پالیسی، اور فیصلہ سازی میں خواتین کا بھرپور کردار ہو اور برابری اور مساوات کے ساتھ انھیں بھی اپنے حقوق کی حصولیابی کا حق حاصل ہو۔

Dr. Meher Fatima Hussain
Associate Professor,
Sarojini Naidu Centre for Women's Studies,
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

ارتباط

ماہنامہ خواتین دنیا کا جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔ فہرست دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ کیونکہ اس شمارہ میں شامل بیشتر مضامین بے ساختہ متوجہ کرنے والے تھے۔ جیسے آغاز میں ہی صغری عالم جیسی شخصیت جو گلبرگہ شہر سے وابستہ تھیں ان کے بارے میں مضمون پڑھنے کو ملا۔ چونکہ گلبرگہ شہر ہمارا شہر ہے اس لیے اس شہر سے وابستہ کوئی بھی ادبی شخصیت کو خواتین دنیا میں پڑھنا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔

اس کے بعد آگے بڑھے تو ''بی اماں'' نظر آئیں۔ اور جب ''بی اماں'' ہوں تو وہاں سے یوں نظریں پھیر کر بالکل نہیں جا سکتے۔ اس لیے مکمل ادب واحترام کے ساتھ ان پر یہ مضمون پڑھا اور بی اماں جیسی غیور خاتون کو خراج عقیدت پیش کیا اور دل میں دعا کی کہ آج کی مائیں بھی اولاد کی تربیت کے حوالے سے ایسا ہی کردار پیش کریں۔

جہان نسواں کے تحت جو چار مضامین تھے وہ بے حد عمدہ تھے۔ منٹو کو ان کے ادب کے حوالے سے جاننا بہت اچھا رہا۔ مہاراشٹرا اور بہار ان دونوں ریاستوں کو ادب کے حوالے سے پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اور ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ خود نوشت، سفرنامہ اور خواتین بھی اچھا سیگمنٹ تھا۔

اس کے علاوہ سماج میں خواتین کی حصہ داری، اردو ادب میں خواتین کا کردار، ہندوستانی نسائی شاعری کے موضوعات یہ سارے مضامین لائق مطالعہ رہے۔

سحر اسعد کا افسانہ ہلکا پھلکا تھا اور آج کل کی لڑکیوں کے حوالے سے درست تھا۔ آج کل لڑکیاں پڑھائی سے غافل ہیں اور اپنے آپ کو غلط سرگرمیوں میں ملوث کر رہی ہیں۔

دونوں غزلیں، اچھی تھیں خصوصاً فرزانہ پروین کی غزل نے متاثر کیا۔ خواتین کی صحت کے حوالے سے ہر ماہ جو مضامین شامل ہوتے ہیں وہ معلوماتی اور مفید ہوتے ہیں۔ اور خواتین کی صحت کے حوالے سے کئی غلط فہمیوں کو دور کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر خواتین دنیا کا یہ شمارہ شاندار تھا۔ لیکن اس سے ایک شکایت ہے کہ چونکہ رسالہ ہمیں لیٹ ملا اس لیے ہم فروری کے خواتین دنیا کے گوشۂ خواتین اور سائنس میں باوجود خواہش کے شامل نہیں ہو سکے کیونکہ رسالہ بیس جنوری کو موصول ہوا اور اس گوشۂ میں شمولیت کے لیے مضامین وغیرہ بھیجنے کے آخری تاریخ پندرہ جنوری تھی۔

اس سے ہٹ کر ہمیں خواتین دنیا سے کوئی شکایت نہیں۔ دن بہ دن یہ رسالہ بہتری کی جانب گامزن ہے جس کے لیے ہم رسالہ کے مدیر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ رسالہ یونہی ترقی و کامرانی کے سفر میں آگے بڑھتا رہے۔

نازنین فردوس، حیدرآباد دکن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا رسالہ ''ماہ نامہ خواتین دنیا''، جنوری، 2025 موصول ہوا۔ جس کے سرورق پر کچھ منور اور کچھ موہوم پھلجھڑیاں نئے سال کی آمد اور امیدوں کی نئی کرنیں بکھیرتی ہوئی انسانی احساسات و توقعات کو ابھارتی ہیں۔ اداریے کے ضمن میں خواتین

کے حقوق کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ہندوستانی دستور نے جہاں مردوں کو حقوق دیئے وہیں خواتین کو بھی مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔

مذکورہ شمارے میں دس مضامین شامل ہیں۔شخصیت میں ''صغریٰ عالم: مابعد آزادی گلبرگہ کی اولین نسائی آواز'' کو پیش کیا گیا ہے۔جہان نسواں میں ''علی برادران کی والدہ بی اماں، مہاراشٹر میں 1980 کے بعد ادب اطفال، منٹو کے افسانے اور نسوانی کردار، بہار کے چند اہم رسائل مختصر جائزہ'' وغیرہ قابل ذکر مضامین ہیں۔

نیلو فر فردوس کا مضمون ''سماج کے مختلف شعبوں میں خواتین کی حصے داری'' میں بہت عمدہ طریقے سے خواتین کے مسائل کو روشناس کرایا گیا ہے کہ کس طرح عورتیں ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہیں۔اس شمارے کا افسانہ ''واردات'' بہت سبق آموز ہے۔''سیدہ بانو کی خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' ایک مطالعہ'' جس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ سیدہ بانو کس طرح ایک پر اعتماد بہ ہمت خاتون تھیں، جنھوں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی کبھی ہمت پست نہیں کی۔''اردو ادب کی اہم خواتین افسانہ نگار'' اس مضمون کے تحت کئی اہم خواتین افسانہ نگار کے بارے میں معلومات فراہم ہوئیں۔حسن سخن کے تحت جوہی بیگم شاما اور فرزانہ پروین کی نظمیں شامل ہیں، جس کا موضوع حقیقت پر مبنی ہے۔

مذکورہ اشعار دل کے بہت قریب محسوس ہوئے۔صحت کے ضمن میں سعدیہ زاہد کا مضمون ''خواتین کی صحت مند زندگی کے لیے غذا کی اہمیت'' اچھی صحت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔قارئین کے خطوط کے ضمن میں جو مشورہ دیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔بہر حال یہ شمارہ ہر لحاظ سے کافی معلوماتی اور عمدہ ہے۔

شیما خانم (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)
الف 55۔شاہین باغ، نئی دہلی۔110025

ماہنامہ خواتین دنیا جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔اس کو حرف بہ حرف پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ماہنامہ "خواتین دنیا" آدھی آبادی کی حیثیت رکھنے والی نہ صرف خواتین بلکہ پورے معاشرے کے لیے اہم ہے۔یہ ماہنامہ "خواتین دنیا" اس آدھی آبادی کے احساس و جذبات کی بہترین ترجمانی کرا سے پورے معاشرے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ماہنامہ خواتین دنیا نہ صرف معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں اور خوبصورت نظمیں اپنے قارئین کو پیش کرتا ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے موضوعات پر بھی اپنی نظر بنائے ہوئے ہے۔یہ پہلی بار نہیں ہے کہ جب ماہنامہ ''خواتین دنیا'' میں اس طرح کے موضوع پر بحث کی جارہی ہو بلکہ اس سے پہلے بھی کئی مضامین اور تحریریں سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق اس ادبی رسالے میں شائع ہو چکی ہیں۔اس شمارے کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کی معلومات میں خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔شمارے میں سب سے پہلے "صغری عالم: مابعد آزادی گلبرگہ کی اولین نسائی آواز" کے عنوان پر لکھے گئے مضمون پر نظر پڑتی ہے۔جو سید عبدالحکیم کے ذریعے تحریر کردہ ایک بہت اہم اور معلوماتی مضمون ہے جس میں صغری عالم (1938ء-2011) کی شخصیت پر گہرائی سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔آزادی کے بعد پہلی خواتین شاعرہ تھیں۔اس کے بعد دوسرے عنوان نے توجہ مبذول کی جو سماج میں مختلف شعبوں میں خواتین کی حصے داری جیسے موضوع پر لکھا گیا ہے جسے نلوفر نے تحریر کیا ہے نیلوفر بالکل ٹھیک فرماتی ہیں کہ آج کے دور میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں خواتین کی حصہ داری سے انکار کیا جائے۔ان پوری کوشش اور توجہ کے ساتھ لکھا گیا یہ مضمون ایک بہتر مضمون کہلایا جا سکتا ہے۔مضمون کا تحریری دائرہ وسیع ہے کیونکہ یہ عالمی سطح پر لکھا گیا ہے۔ماہنامہ ''خواتین دنیا'' کہ دوسرے مضامین بھی انفرادی پہلوؤں سے بھرپور ہیں۔ماہنامہ خواتین دنیا میں صحت سے متعلق ایک موضوع رہتا ہے جس سے خواتین میں پائے جانے والے امراض سے بیداری ہو جاتی ہے۔اس سے آج کی خواتین بیدار ہو کر اپنی صحت کا اور اچھی طرح سے خیال رکھنے میں مدد محسوس کرتی ہیں۔یہ بہت بہتر قدم ہے۔جس کی ذمے داری ادارہ بہت ہی محنت سے نبھا رہا ہے۔صحیح وقت پر بیدار ہو کر امراض کی پہچان کرنا بہت ضروری ہوتا ہے جس سے جلد سے جلد علاج میں مدد مل سکے۔قومی کونسل کے چاروں ہی رسالے ہر اعتبار سے بہت خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں خدا اس ادارے کو اور زیادہ ترقی دے۔

مبینہ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

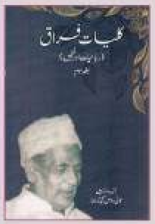

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

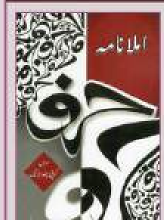

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

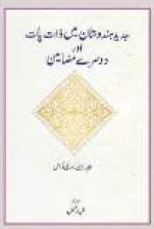

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

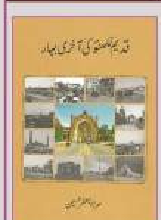

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

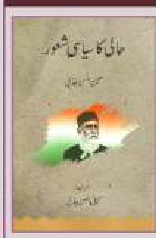

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

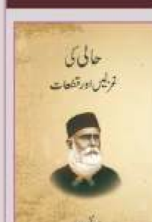

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, मार्च – २०२५ वर्ष:९, अंक: ३
Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2025, Vol.9, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-03-2025
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

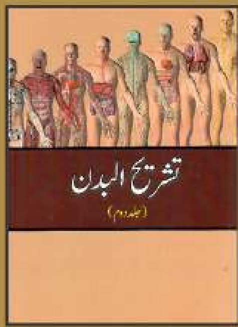

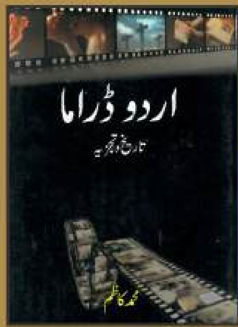

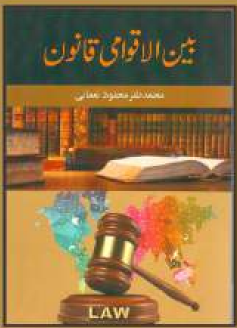

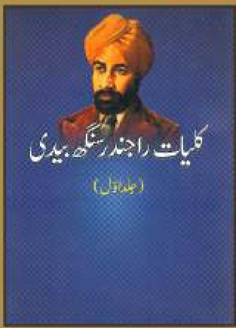

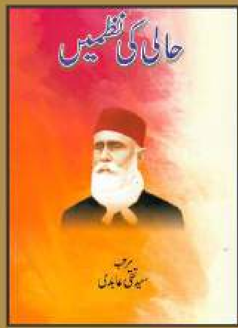

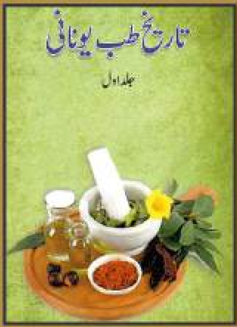

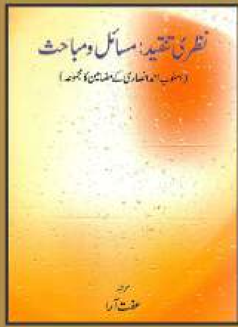

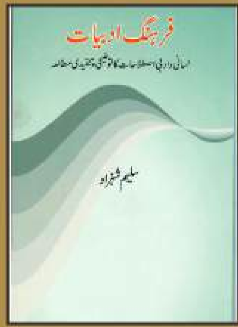

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025